# ابرار احمد کے دو شعری مجموعے ایک ہی پی ڈی ایف فائل میں

ڈھیر محبت کرنے والوں کے صدقے
مٹھی بھر نفرت کرنے والوں کی خیر

فریحہ نقوی

پی ڈی ایف کاپی،
فریحہ نقوی کے نام
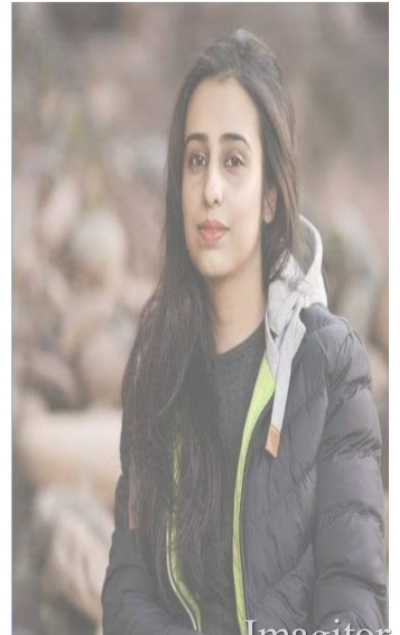
# غفلت کے برابر

ابرار احمد
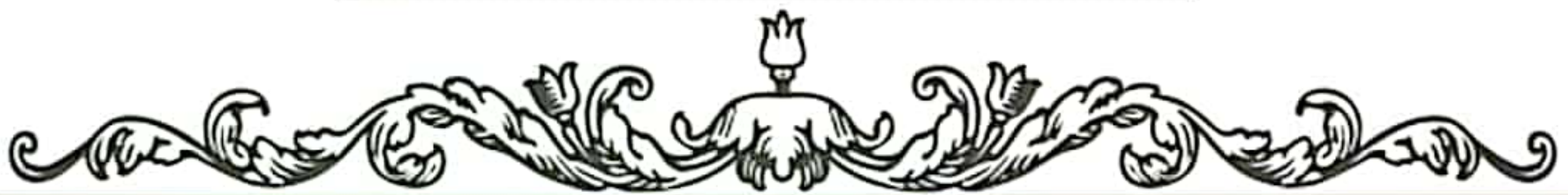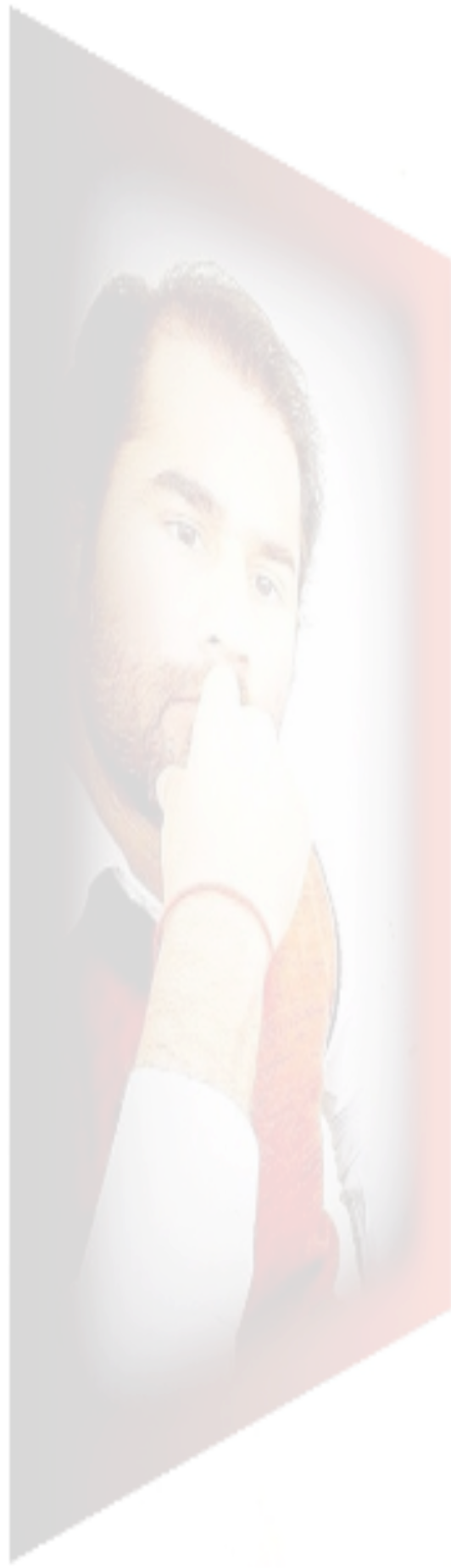
غفلت کے برابر

الحمد لائبریری
فیس بک گروپ۔ کتابیں پڑھیے
ابرار احمد
سید حسین احسن
Imagitor



ماورا

## ضابطہ

بار اوّل : ۲۰۰۷ء
کمپوزنگ : ماورا کمپوزنگ
ناشر : ماورا پبلشرز' لاہور
طابع : شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور
قیمت : -/250 روپے



MAVRA BOOKS
60-The Mall, Lahore.
Ph: 6303390 - 6304063
Mob: 0300-4020955
0333-4224788
E-mail-mavrabooks@yahoo.com

# والدین کے نام

آنکھیں تھیں چاہتوں بھری، چہرے جو مہربان تھے
اب وہ نظر نہ آئیں گے، اب انہیں بھول جائیے

□□□

شاعری میرا طرزِ زندگی کیوں ہے، میں نہیں جانتا۔ پابلو نیرودا نے درست کہا تھا کہ یہ انجان گلی کا بلاوا ہے۔ بہت ابتدائی برسوں میں مجھے بھی اسی انجان گلی سے پکارا گیا اور میرے اندر کوئی غیر واضح سی تبدیلی پیدا ہوئی۔ میں بھٹکنے لگا کسی ان دیکھی، ان جانی بے چینی کے دباؤ میں اور تا حال بھٹک رہا ہوں۔ میرے نزدیک یہ ایک بے سمت طرزِ زندگی ہے جسے ایک نوع کی ذمہ دارانہ بے راہروی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اپنے آپ اور اپنے معروض سے بامعانی علیحدگی۔

زندگی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ اس کی حقیقت، اس کے جواز پر غور کرتے چلے جانے کا اذیت ناک دور طویل اور سخت صبر آزما تھا۔ خود کو زندہ رہنے پر آمادہ کرنے کے لیے مجھے بہت تکلیف اُٹھانی پڑی۔ بہت سے جھوٹ، سچ کی طرح تسلیم کرنا پڑے۔ بالآخر میں نے اس لایعنیت کو قبول کر لیا ہے۔ زندگی لاکھ Absurd سہی، اس سے پرے تو اور بھی Absurdity ہے۔ مٹی کی حقیقت۔ ہونا شاید اسی لیے نہ ہونے سے زیادہ قابل قبول لگتا ہے۔

کامیو نے کہیں لکھا ہے کہ اُس شخص کی جلاوطنی لاعلاج ہوا کرتی ہے جس کے پاس نہ تو کسی گم شدہ گھر کی یادیں ہوں اور نہ مستقبل میں کسی خوشگوار زمین کے حصول کا خوش کن وعدہ۔ میرے پاس کم از کم ایک گم شدہ گھر کی

تاب کے ساتھ۔ شاید اس لیے میری جلا وطنی کو مختلف ٹھکانوں میں کہیں اماں مل جاتی ہے۔

زندگی جو میں بظاہر جی رہا ہوں، اس میں کوئی عنصر ایسا ہے جو میرے اندر تعلق اور لاتعلقی کو ساتھ ساتھ لے کر چلتا رہتا ہے۔ ایک اور طرح کا وجود میرے اندر پھلتا پھولتا، حرکت کرتا، پریشان کرتا اور میری اصل حقیقت کو ہمیشہ یاد دلائے رکھتا ہے، ٹھیک سے رہنے نہیں دیتا۔ ایک بے پناہ اُجاڑ میرے اندر ہمیشہ خیمہ زن رہا ہے۔ میرا شاید ہی کوئی ایک دن اس غیر واضح دل گرفتگی سے آزاد گزرا ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے، مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ بے معنویت، لاحاصلی جیسے الفاظ اسے بیان کرنے سے قاصر ہیں، لیکن اس لاتعلقی کے باوجود میں اپنے اردگرد موجود ہر چیز سے تعلق محسوس کرتا ہوں، ایک محبت بھرا اور والہانہ تعلق، جس کے پیچھے نہ کوئی مقصد کارفرما ہے، نہ منطق۔ مجھے اپنے گردوپیش کے عقب میں تاریکی دکھائی دیتی ہے، پھر بھی یہ رونق مجھے اچھی لگتی ہے۔ جہاں تک مقصد کا تعلق ہے تو آج جب میں اپنی عمر کی ڈھلوان پر لڑھکتا جا رہا ہوں، یہ سوال اور بھی مضحکہ خیز دکھائی دیتا ہے کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے اور کیا ضروری ہے کہ ہر آدمی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور متعین کرے۔



زندگی کا خوبصورت ترین مظہر انسان ہے۔ زندہ رہنے کے معانی انسان ہی دے سکتا ہے۔ میری دلچسپی کا سب سے بڑا محور و مرکز انسان ہی ہے۔ یہ سب تماشا اسی کا لگایا ہوا ہے۔ یہ جو تھوڑی بہت معنویت ہم اپنے شب و روز میں موجود پاتے ہیں، انسان ہی کے دم سے ہے۔ دکھ بھی وہی دیتا ہے، خوشی بھی وہی کرتا ہے۔ تنہائی بھی اس کی دین ہے، ہنگامہ اور بزم آرائی بھی۔ میں اگر شعر کہتا ہوں تو جہاں ان گنت غیر واضح اور مبہم کیفیات اس کی ذمہ دار ہیں، وہیں انسان اس کا سب سے بڑا معلوم محرک ہے۔ میں اس کے سامنے جواب دہ ہوں اور لوٹ کر بھی اس کی جانب جاتا ہوں۔ جہاں میں خود سے مختلف لوگوں کو جاننے کی کوشش

کرتا رہتا ہوں وہیں مجھے اپنے جیسے لوگ تنہا نہیں رہنے دیتے۔ جن کے علم کی بنیاد لاعلمی کا ادراک ہے اور جو اس ملال کے حوالے سے میرے جیسے ہیں یا میں ان جیسا ہوں۔ طاقتور انسانوں کے ایک منظم اور مربوط گروہ نے ہم سے ہماری آزادی چھین رکھی ہے۔ ملنے کی آزادی، چناؤ کی آزادی، فکری، معاشی اور روحانی آزادی۔ اس تسلط کا سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ ہم موجود ہوتے ہوئے بھی عدم موجود ہیں، Non entity ہیں، سو اوروں کی طرح میں بھی دیوار سے لگا ہوا بے دست و پا انسان ہوں۔ چاہتا کچھ ہوں، ہوتا کچھ ہے۔ کرنا کچھ چاہتا ہوں، کرتا کچھ اور رہتا ہوں۔ جہاں مجھے ہونا چاہیے، وہیں پر نہیں ہوں اور مجھے کہاں ہونا چاہیے اس کا بھی کچھ علم نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مجھے لگتا ہے، بنانے والے نے میری بنیاد میں کوئی اینٹ ٹیڑھی رکھ دی ہے۔ سو ایک رخ سے میں ٹیڑھا ہی رہا ہوں۔ میرے اور میرے ماحول کے درمیان تضاد ہے، تناؤ ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کھینچا تانی، اکتاہٹ کے مراحل سے گزار کر مجھے لاتعلقی کی سخت پتھریلی زمین پر لا پٹختی ہے۔ جہاں کوئی ہاتھ بڑھ کر مجھے پھر سے زندگی کی جانب لے جاتا ہے۔

ڈاکٹری کے پیشے نے مجھے زندگی کے بہت قریب رکھا۔ اس انسانی تماشے کے، جو انسان کو اپنے اندر بری طرح اُلجھا دینے والی خوبصورتی رکھتا ہے۔ میں لوگوں سے تحاشا ملا ہوں، ایک طرح کے والہانہ پن کے ساتھ۔ ان کی تکالیف اور خوشیوں میں شریک رہا ہوں۔ اس سب نے میرے اندر رونق لگائے رکھی ہے۔

شاعری نے مجھے اور کچھ دیا یا نہیں، جینے کا آسرا اور معانی ضرور دیے، جزوی اور ناکافی ہی سہی۔ میرے باطن میں جو جھلسا دینے والی دھوپ ہے، یہ اسے پوری طرح

چند باتیں شعری اصناف کے حوالے سے بھی کہہ دوں کہ اس حوالے سے مباحث سر اُٹھاتے رہتے ہیں اور لکھنے والے کو اس حوالے سے واضح نقطۂ نظر کا حامل ہونا چاہیے۔ غزل کی نسبت نظم کو میں نے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے زیادہ قریب پایا۔ گو میں نے منصوبہ بندی سے کبھی شاعری نہیں کی۔ بس یہ آ جاتی ہے، کبھی افتاد کی صورت، تو کبھی سکون بخش مصروفیت کی شکل میں۔ نظم گوئی سے غزل کی جانب میں یونہی نہیں چلا آیا۔ تخلیقی سفر کے ہر مرحلے پر میں نے غزل بھی کہی، یہ الگ بات کہ اسے نظم جتنی توجہ دی تھی نہ اہمیت۔ غالباً ۲۰۰۰ء کے آس پاس غزل مجھ پر باقاعدہ طاری ہو گئی۔ میں نے اتنی تیز رفتاری سے زندگی بھر شاعری نہیں کی۔ اس تخلیقی وفور کا نتیجہ ہے یہ مجموعہ، جو مجھے بتاتا ہے کہ میرے اندر ایک طوفان ایسا ضرور تھا جو اسی صنف کی وسعت یا محدودیت ہی میں پوری طرح سما سکتا تھا۔

غزل بے پناہ امکانات کی حامل صنف ہے جسے خواہ مخواہ ہمارے ''جدید'' نظریہ ساز ٹھوکر پر رکھ لیتے ہیں۔ یہ فراموش کرتے ہوئے کہ اُردو شاعری کی پوری روایت اس بنیاد پر استوار ہے۔ جس تہذیبی نشاط اور وژن سے ہمیں غزل آشنا کرتی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے اس لیے میں خود کو غزل کی افادیت سے انکار پر کبھی آمادہ نہیں کر سکا۔ تمام شعری اصناف دراصل مل جل کر ایک سمفنی (Symphony) بناتی ہیں جس میں سے ایک سُر بھی نکال دیا جائے تو وہ محض شور بن کر رہ جائے گی۔ ہمارے بعض پرجوش تجربہ پسند شعرا نے نظم اور غزل دونوں میں اس بات پر اصرار کیا ہے کہ شاعری محض لفظوں کا کھیل ہے اور کوئی بات نئی بات نہیں۔ مجھے اس سے کبھی اتفاق نہیں رہا کیونکہ مجھے کوئی ایک بھی بڑا یا اہم شاعر ایسا دکھائی نہیں دیا جس کے پاس بڑی فکر یا اس کی نشانیاں موجود نہ ہوں۔ لفظوں کے بغیر شاعری ظاہر ہے ممکن ہی نہیں، لیکن لفظ بات کہنے کا وسیلہ ہیں، مقصد نہیں۔ ہاں آپ لفظوں کے استعمال پر قدرت حاصل کر کے زیادہ بڑا کمال دکھا سکتے ہیں۔ تسلیم کہ زبان کے خوبصورت

استعمال کے بغیر کام نہیں چلتا لیکن فکر، جذبے، خیال یا احساس کی گہرائی کے بغیر بھی بات کہاں بنتی ہے۔ لفظوں پر کامل تخلیقی دسترس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ فکری عناصر کی موجودگی ہی شاعری کو وہ ارتفاع عطا کر سکتی ہے جسے ہم بڑی شاعری کا نام دیتے ہیں۔

غزل کی قدامت شاعر کے لیے تقویت اور نقاہت دونوں کا سبب بن سکتی ہے۔ ہمارے تن آسان غزل گو اس کے Format کے تقاضوں کو پورا کرنا کافی سمجھتے ہوئے جہاں خود کو ضائع کر دیتے ہیں وہیں ایسی غزل سامنے لے آتے ہیں جس پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔ دوسری جانب بعض باکمال اور اہم شعراء نے نہ جانے یہ کیوں ٹھان رکھی ہے کہ وہ غزل کی دنیا میں انقلاب برپا کر نے آئے ہیں۔ ایسے تمام منہ زور تجربات ناکام ہو چکے ہیں اور اب ماضی کا حصہ ہیں۔ غزل کو اس کی روایت سے الگ کر کے تخلیق کیا ہی نہیں جا سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ باطنی اور خارجی ہر دو سطحوں پر اسے اس کی وضع قطع اور طور طریقوں کے مطابق ہی رہنے دیا جائے۔ ورنہ یہ آپ کو کہیں کا نہیں رہنے دے گی۔

میں نے اپنے طور پر غزل کو اس کے تقاضوں اور طور طریقوں کو سامنے رکھتے ہوئے تخلیق کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ کامیاب یا ناکام، میں نہیں جانتا۔ جہاں یہ کوشش خالصتاً انفرادی سطح کی رہی وہیں یہ میری خوش بختی ہے کہ مجھے محمد خالد اور علی افتخار جعفری جیسے اہل نظر دوستوں کی رفاقت اور مخلصانہ مشاورت بھی دستیاب رہی ہے۔ میرے عزیز اور قریبی دوست ظفر اللہ کی محبت اور تعاون کے بغیر شاید کتاب کی جلد اشاعت ممکن نہ ہو سکتی۔

ابرار احمد

۱۶ جنوری ۲۰۰۷ء

اور کب تک بہم رہیں گے یہاں
تو رہے گا کہ ہم رہیں گے یہاں
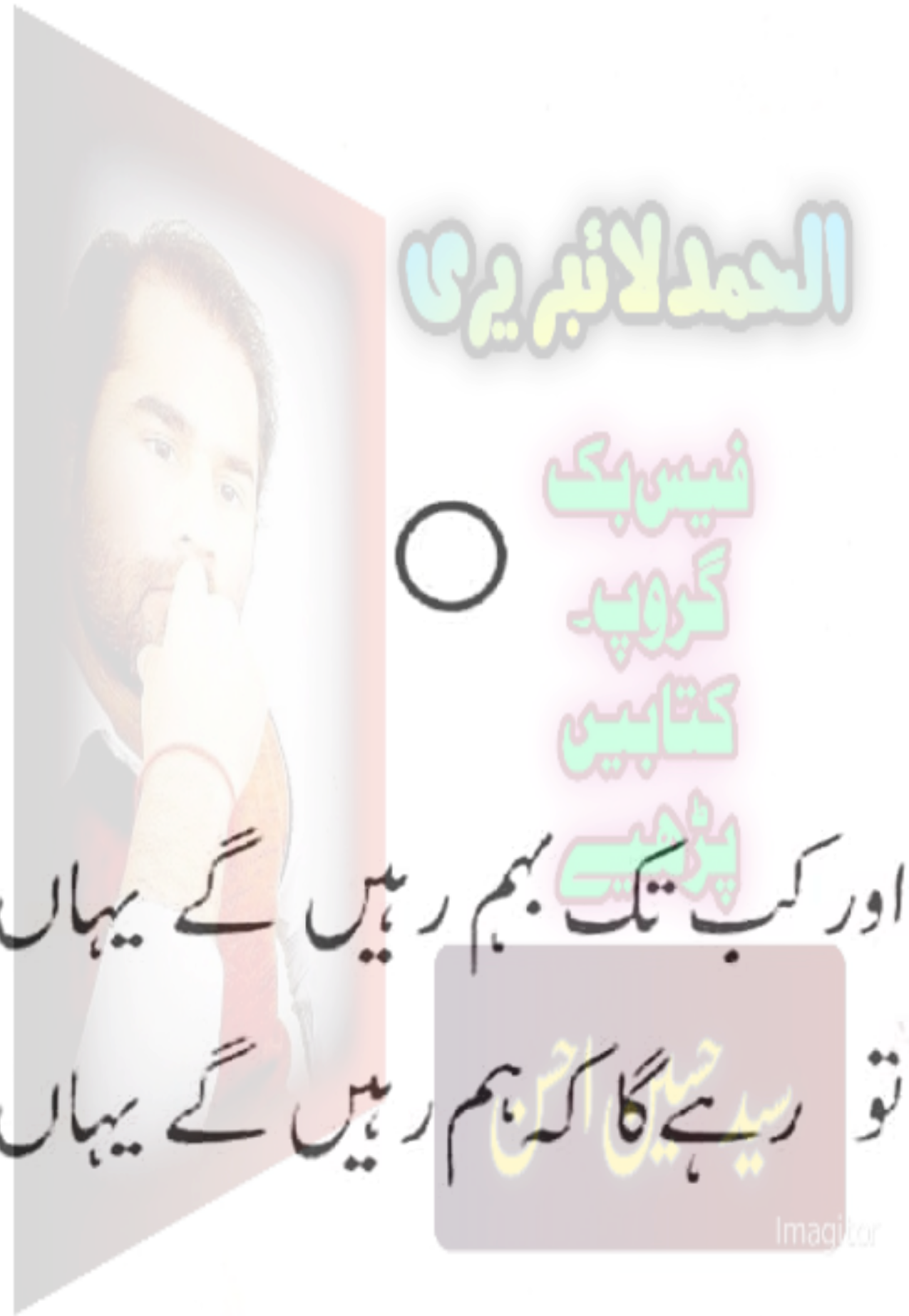
راہرو دور جا چکے ہوں گے
راہ کے پیچ و خم رہیں گے یہاں

ہم یہاں ہوں گے یا نہیں ہوں گے
اُس کے لطف و کرم رہیں گے یہاں

دل میں تیری مہک اترنے تک
ہم تو خواب عدم! رہیں گے یہاں

تیری مٹّی بکھر چکی ہو گی!
تیرے نقشِ قدم رہیں گے یہاں

ابھی اُس آنکھ کا اشارہ نہیں
ہم ابھی کوئی دم رہیں گے یہاں

تیرے مہماں ہوئے، خراب ہوئے
پھر جو آئے تو کم رہیں گے یہاں

○



ہم نے رکھا تھا جسے اپنی کہانی میں کہیں
اب وہ تحریر ہے اوراقِ خزانی میں کہیں

بس یہ اک ساعتِ ہجراں ہے کہ جاتی ہی نہیں
کوئی ٹھہرا بھی ہے اس عالمِ فانی میں کہیں



جتنا ساماں بھی اکٹھا کیا اس گھر کے لیے
بھول جائیں گے اسے نقلِ مکانی میں کہیں

مرکزِ جاں تو وہی تُو ہے مگر تیرے سوا
لوگ ہیں اور بھی اُس یادِ پرانی میں کہیں

خیر اوروں کا تو کیا ذکر، کہ اب لگتا ہے
تو بھی شامل ہے، مرے رنجِ زمانی میں کہیں

آج کے دن میں کسی اور ہی دن کی ہے جھلک
شام ہے اور ہی اس شام سہانی میں کہیں

چشمِ نمناک کو اس درجہ حقارت سے نہ دیکھ
تجھ کو مل جانا ہے اک دن اسی پانی میں کہیں

کیا سمجھ آئے کسی کو، مجھے معلوم بھی ہے
بات کر جاتا ہوں مَیں، اپنی روانی میں کہیں

جشنِ ماتم بھی ہے، رونق سی تماشائی کو
کوئی نغمہ بھی ہے اس مرثیہ خوانی میں کہیں

اب کہیں آ کے جو شرمندۂ تعبیر ہوا
خواب دیکھا تھا وہ ایامِ جوانی میں کہیں

کہ جیسے کنجِ چمن سے صبا نکلتی ہے
ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے

قدم بڑھاؤں تری رہگذار ہے آخر
مگر یہ راہ کہیں اور جا نکلتی ہے

ہر ایک آنکھ میں ہوتی ہے منتظر کوئی آنکھ
ہر ایک دل میں کہیں کچھ جگہ نکلتی ہے

یہیں کہیں پہ ہے رستہ، دوامِ وصل کا بھی
یہیں کہیں سے ہی راہِ فنا نکلتی ہے

ضرور ہوتا ہے رنجِ سفر مسافت میں
کہ جیسے چلنے سے آوازِ پا نکلتی ہے

ہم اپنی راہ پکڑتے ہیں، دیکھتے بھی نہیں
کہ کس ڈگر پہ یہ خلقِ خدا نکلتی ہے

یہاں وہاں کئی چہرے میں ڈھونڈتے ہیں تمھیں
ہمارے ملنے کی صورت بھی کیا نکلتی ہے

خیال کر کہیں پھر دیر ہی نہ ہو جائے
کہ اب تو آہ بھی بے مدعا نکلتی ہے

جو ہو سکے تو سنو زخمۂ خموشی کو
کہ اس سے کھوئے ہوؤں کی صدا نکلتی ہے

گماں سا ہوتا ہے جس بھی جگہ پہ منزل کا
پہنچ کے دیکھیں تو وہ راستہ نکلتی ہے

چھپائے رکھتا ہوں چشمِ ہوس کو دل میں کہیں
وہ سامنے ہو تو پھر سے یہ آ نکلتی ہے



پہلے تو کھینچتا ہے دامنِ دل
پھر بلاتی ہے ہم کو دنیا بھی

○



دہر میں یوں تو کیا نہیں موجود
پھر بھی وہ لطف سا نہیں موجود

جو میسّر رہا، غنیمت تھا
جو میسّر رہا، نہیں موجود

یادِ یاراں کا داغ جلتا ہے
اور کوئی دِیا نہیں موجود

اس خمارِ طلب میں کھلتا نہیں
کیا ہے موجود، کیا نہیں موجود

پہلے اذنِ کلام غائب تھا
اور اب مدعا نہیں موجود

دو گھڑی تم ہو، دو گھڑی ہم ہیں
کوئی ہم میں سدا نہیں موجود

اب یہیں خاک ہو رہیں گے ہم
اب کوئی راستا نہیں موجود

اے غبارِ رہِ طلبگاراں!
کہیں اس کا پتا نہیں موجود

ہم نے مانگا نہیں ہے جب کچھ بھی
پھر ہمیں کیا، کہ کیا نہیں موجود

ہم پہ اے دوست ہاتھ رکھ اپنا
ہم میں اب حوصلہ نہیں موجود

............

○



تیری جانب سے، نہ کچھ گردشِ حالات سے ہے
کچھ خجالت ہے تو بس اپنی ہی اوقات سے ہے



ہاں محبت کے لیے ایسی ضروری بھی نہیں
ہاں شکایت کا تعلق تو ملاقات سے ہے



دن یہاں کاٹنے آئے ہیں الجھنے کو نہیں
سو ہمیں جیت سے مطلب ہے نہ کچھ مات سے ہے

تم یونہی مجھ سے گریزاں ہو، مری قسمت کا
واسطہ اور کسی نوع کی آفات سے ہے

یہ جو ہر دل میں کہیں گھر سا بنا لیتا ہوں
اس محبت میں قرینہ مری عادات سے ہے

اب حدِ سود و زیاں سے نکل آیا ہوں کہاں
کام کچھ بے طلبی سے ہے، نہ حاجات سے ہے

کچھ بھی اچھا نہیں ہونے کا، مگر ہے جو بھی
تیری خوش فہم طبیعت کی کرامات سے ہے

یہ جو بارش ہے کہیں اور برس لیتی ہے
میری آنکھوں کی نمی اور ہی برسات سے ہے



جب یہ طے ہے کہ تعلق کوئی رہنے کا نہیں
پھر بھلا مجھ کو یہ الجھن تری کس بات سے ہے

مے کدہ بند ہوا، بھر گیا پیمانۂ جاں
گفتگو اب در و دیوارِ خرابات سے ہے

...........

اور رہنا تھا کیا فاصلہ رہ گیا
دور تک میں اسے دیکھتا رہ گیا

کام یوں تو مکمل کیے ہیں سبھی
زندگی میں خدا جانے کیا رہ گیا

سو چکا تھا تہِ خاک میں جس گھڑی
میرے اندر کوئی جاگتا رہ گیا

کھو گئے ہمرہاں جانیے کیوں کہاں

تا بہ حدِ نظر راستہ رہ گیا

رقصِ ہر رنگ تھمتا گیا آخرش

اور پھر ایک رقصِ ہوا رہ گیا



جاننا کیا ضروری تھا اس ربط میں؟

کس لیے تو مجھے جانتا رہ گیا



لاتعلق رہے اس تعلق میں ہم

اور جامِ تعلق دھرا رہ گیا



سب چراغوں کو بجھنا تھا' بجھتے گئے



آنکھ میں ایک جلتا دیا رہ گیا

O

بجھنے لگی ہے آنکھ، رہِ خواب ہے کہاں
وہ کس گلی میں ہے، دلِ بے تاب ہے کہاں

عالم ہے کوئی اور کہ میں بدحواس ہوں
وہ لوگ کیا ہوئے، مرا اسباب ہے کہاں

ہم وہ نہیں، وہ رنگِ رُخِ یار بھی نہیں
اے ماہِ عمر! تیری تب و تاب ہے کہاں

بیگانگی وہ ہے، ہمیں کچھ سوجھتا نہیں
گھر کس طرف ہے، قریۂ احباب ہے کہاں

کچھ بزم میں شرارۂ دیوانگی نہیں
دُھن چھیڑ دوں کوئی، مرا مضراب ہے کہاں

ہم کو تو ایک لہر نے رستہ نہیں دیا
یہ بحرِ عشق جانیے پایاب ہے کہاں

کچھ ہم کو ہی دماغِ زر و مال اب نہیں
یہ جنس ورنہ شہر میں کم یاب ہے کہاں

سونے لگی ہے چشمِ تماشا بھی آخرش
کھُلتا نہیں، وہ حُسنِ جنوں تاب ہے کہاں



۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

تجھ سے وابستگی رہے گی ابھی
دل کو یہ بے کلی رہے گی ابھی

سر کو دیوار ہی نہیں ملتی
سو یہ دیوانگی رہے گی ابھی

کوئی دن فرصتِ تمنا ہے
کوئی دن سرخوشی رہے گی ابھی

کاسۂ عمر بھر چکا، پھر بھی
کہیں کوئی کمی رہے گی ابھی

شب وہی ہے، جمالِ خواب وہی
آنکھ اپنی لگی رہے گی ابھی

جس قیامت کی آمد آمد ہے
وہ قیامت ٹلی رہے گی ابھی

ہم یقیناً یہاں نہیں ہوں گے
غالباً زندگی رہے گی ابھی

کچھ ابھی رنجِ آرزو ہے ہمیں
آنکھ میں کچھ نمی رہے گی ابھی

تو ابھی مبتلائے دُنیا نہیں
تجھ میں یہ سادگی رہے گی ابھی

لاتعلق ہوں اس تعلق سے
اور یہ دوستی رہے گی ابھی

جی اچٹتا نہیں ہے، لگتا نہیں
سو یہ بیگانگی رہے گی ابھی

کہیں کوئی چراغ جلتا ہے
کچھ نہ کچھ روشنی رہے گی ابھی
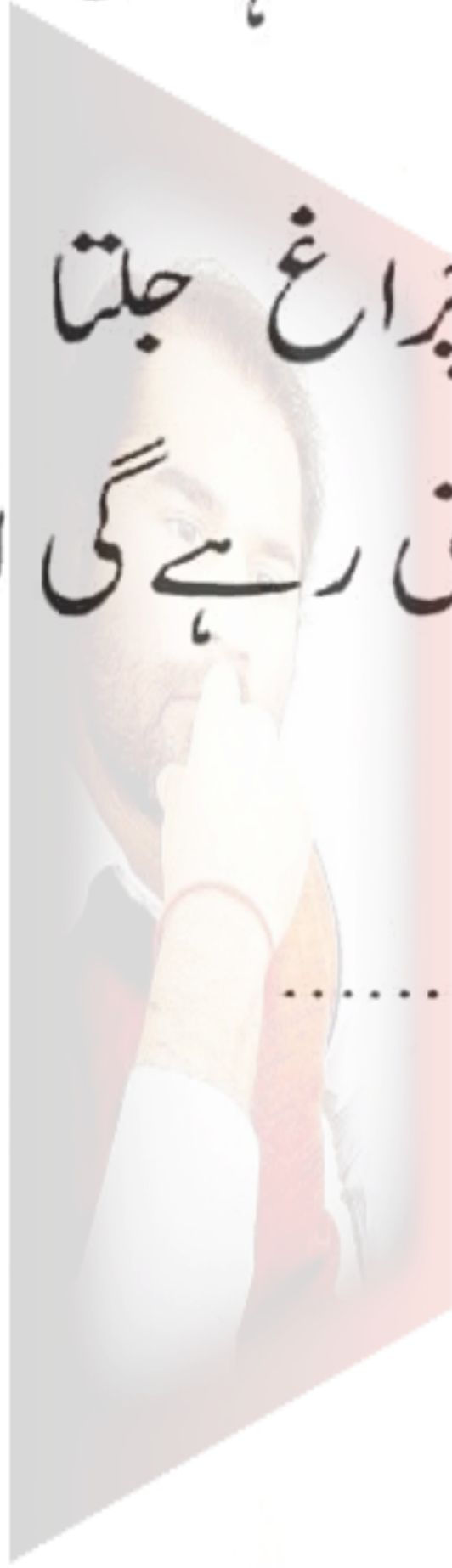
............

دلِ بے حال کی حالت لے جائے
اب جہاں ہم کو محبت لے جائے

اپنی بانہوں سے نکلنے دے ہمیں
اور تعلق کی وہ قیمت لے جائے

ہم کہ اُس راہ پہ جانے کے نہیں
جو سرِ کوئے ندامت لے جائے

گھر کہ زنداں ہے مگر کھینچتا ہے
اب نہ چاہیں بھی تو عادت لے جائے

جا پہنچتی ہے وہیں راہِ وصال
جس جگہ جادۂ فرقت لے جائے

اس نے ہر دم جو عطا کی ہے ہمیں
گر یہ عزت ہے تو عزت لے جائے

کون اس کارگہِ ہستی سے
یہ دل و جان سلامت لے جائے

تو نہیں ہے تو کوئی دن کے لیے
دربدر ہم کو یہ وحشت لے جائے

جو بھی دیکھے اُسے، مَیلا کر دے
وہ کہاں چاند سی صورت لے جائے

کام بھی کرنے ہیں پر کیا کیجیے
وقت سارا تو یہ فرصت لے جائے

جو بپا کرتا ہے، آئے کوئی
اور اس تک یہ قیامت لے جائے

ڈال دے کوئی ہمیں مشکل میں
اور یہ بارِ سہولت لے جائے

جو بھی تھا بس میں، کِیا ہے تو نے
اب جہاں بھی تری قسمت لے جائے

تنگ ہیں اے دلِ وحشی تجھ سے
جا تجھے کوئی مصیبت لے جائے!

○

کبھی روتی، کبھی گاتی ہے ہوا

کیا ہمیں یاد دلاتی ہے ہوا

ہے متاعِ دل و جاں مٹی میں

اور مٹی کو اُڑاتی ہے ہوا

بستیاں دھونے کو، مہکانے کو

بادلوں سے لدی جاتی ہے ہوا

نشۂ خواب ہوا ہوتا ہے

پھر ہمیں آ کے جگاتی ہے ہوا

جانے کس دشت میں گھر ہے اس کا
اور کس دیس کو جاتی ہے ہوا

ہم جنہیں بھول چکے ہوتے ہیں
گیت وہ ہم کو سناتی ہے ہوا

لرز اُٹھتا ہے ہر اِک تارِ نفس
اس قدر شور مچاتی ہے ہوا

تو کہاں ہے مرے صحرا زادے
ہر طرف تجھ کو بلاتی ہے ہوا

خیر مانگو تپشِ دل کی کہ اب
سرد ہوتی چلی جاتی ہے ہوا

آج پھر تیری طرف آ نکلے
آج پھر ہم کو ستاتی ہے ہوا

............

یہ رہِ عشق ہے، اس راہ پہ گر جائے گا تو
ایک دیوار کھڑی ہوگی، جدھر جائے گا تو

شورِ دنیا کو تو سُن، رنگِ رہِ یار تو دیکھ
ہم جہاں خاک اڑاتے ہیں اُدھر جائے گا تو

دربدر ہے تو کہیں جی نہیں لگتا ہوگا
وہ بھی دن آئے گا تھک ہار کے گھر جائے گا تو

عازمِ ہجرِ مسلسل ہُوا اس مٹی سے
لوٹ آئے گا یہیں اور کدھر جائے گا تو

جان جائے گا کہ منزل نہیں موجود کہیں
خوش گماں ہے ابھی سرگرمِ سفر جائے گا تو

آرزو رکھ اسے پانے کی کوئی روز ابھی
پھر یہیں بامِ تمنا سے اتر جائے گا تو

یہ جو طوفان ترے گرد ہے دیوانگی کا
اک ذرا تیز ہُوا اور بکھر جائے گا تو

کارواں گرد ہُوا، چپ ہوئی آوازِ جرس
کیا اب اس سمت کو تا حدِ نظر جائے گا تو

اب کہاں خوابِ محبت کہ وہ شب دور نہیں
جب کہیں خاک بھری نیند سے بھر جائے گا تو

کچھ نہ کچھ تو ہے مگر اتنا نہیں
ہم پہ اب اس کا اثر اتنا نہیں

جانتا ہوں کون کیا لے جائے گا
بے طلب ہوں، بے خبر اتنا نہیں

جس قدر تندی ہے بادِ سرد میں
زور میں رقصِ شرر اتنا نہیں

اُس کو کھونے میں خسارہ ہے بہت
اس کو پانے میں ضرر اتنا نہیں

معرکہ جو تیرے میرے بیچ ہے
درمیانِ خیر و شر اتنا نہیں

اندریں خانہ سراسر شور ہے
جانبِ بیرونِ در اتنا نہیں!

شوق سے آوازۂ محشر لگا
اب ہمارے دل میں ڈر اتنا نہیں

خواب ہوں دیوار و در کے درمیاں
میرا ہونا معتبر اتنا نہیں

دیارِ رفتہ کا قِصّہ کوئی سناؤ میاں
جو خواب سوئے ہوئے ہیں اُنھیں جگاؤ میاں



یہ آپ ہم خس و خاشاک ہیں، ہمارا کیا
ہمیں تو بہنا ہے جس سمت ہو بہاؤ میاں

فساد و شورِ طلب میں گنوا دیا ہے اُسے
وہ ایک شے جسے کہتے تھے رکھ رکھاؤ میاں

ہمیں کہ زخمِ نظارہ پسند بھی ہے بہت
اوراب کے اُس کی جھلک سے لگا ہے گھاو میاں

نہیں اگر رُخِ آیندہ کی خبر معلوم
تو پھر چراغِ رہِ رفتگاں جلاو میاں



جو استطاعتِ خیرِ جہاں نہیں تم کو
تو اس زمیں پہ کوئی حشر ہی اُٹھاو میاں

نہیں ہے گر کوئی رنگِ نشاط کی صورت
تو کوئی محفلِ افسردگاں سجاو میاں

جو دن ملے ہیں پھرو چار دانگِ عالم میں
لگا ہوا ہے یہاں سب کا چل چلاو میاں

نہیں رہے گا نشاں تک جہانِ امکاں میں
جو ہو سکے تو یہاں بات کچھ بناو میاں
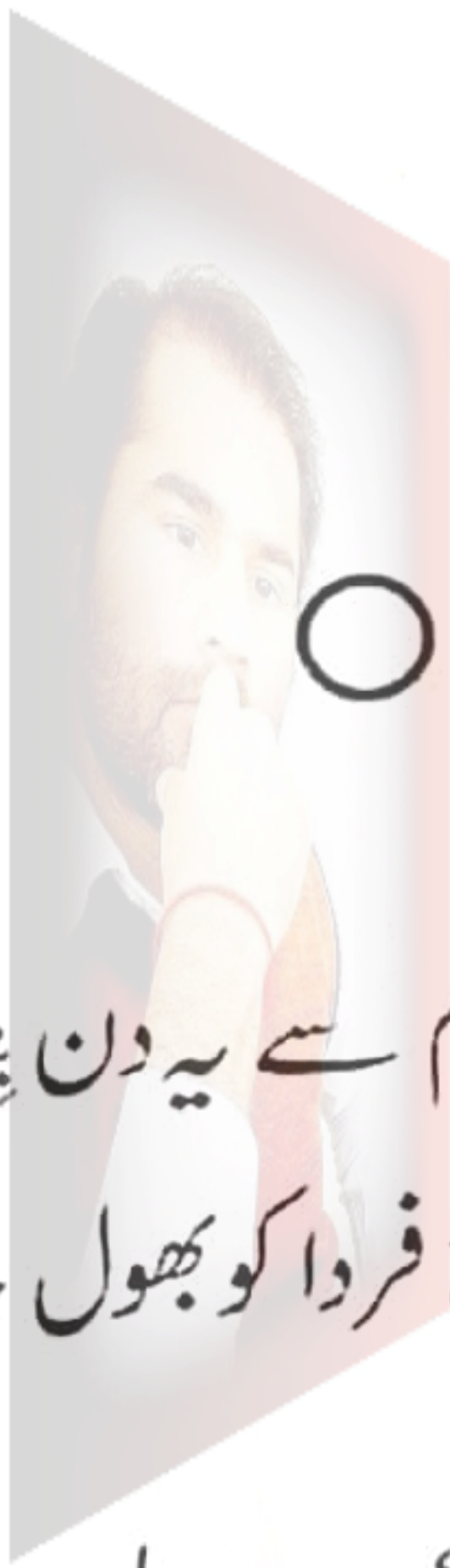
جو پاس ہے اسی غم سے یہ دن بِتاؤ میاں
اب اس کے وعدۂ فردا کو بھول جاؤ میاں

نہ تم، نہ دُنیا تمھاری، ہمارے بس میں ہے
ہمیں تو دیکھنا ہے جو بھی دن دکھاؤ میاں

نہیں ہے پاسِ ادب، کچھ بھرم ہی رہنے دو
جو جی میں آئے کرو، کیوں ہمیں بتاؤ میاں

یہ بے گھری تو بہر طور ساتھ ہے، پھر بھی
برا بھلا ہی سہی، گھر کوئی بساؤ میاں

یہ نقدِ جاں لیے آئے تھے ہم تمہارے حضور
سو تم بھی کرنے لگے ہم سے بھاؤ تاؤ میاں

ہمیں تو چاہیے ہر حال میں تمہاری خوشی
تمہارا گھر ہے یہ، جب چاہو آؤ جاؤ میاں

جو لوگ سیلِ زماں میں بچھڑ گئے ہم سے
جو ہو سکے تو انھیں پھر سے ڈھونڈ لاؤ میاں



بساطِ دہر الٹ دیں نہ ہم تو نام نہیں
رہِ جنوں میں کبھی ہم کو آزماؤ میاں

کہیں یہ حدِ ادب ہی نہ پار ہو جائے
بھرے ہوئے ہیں ہمیں اور مت ستاؤ میاں
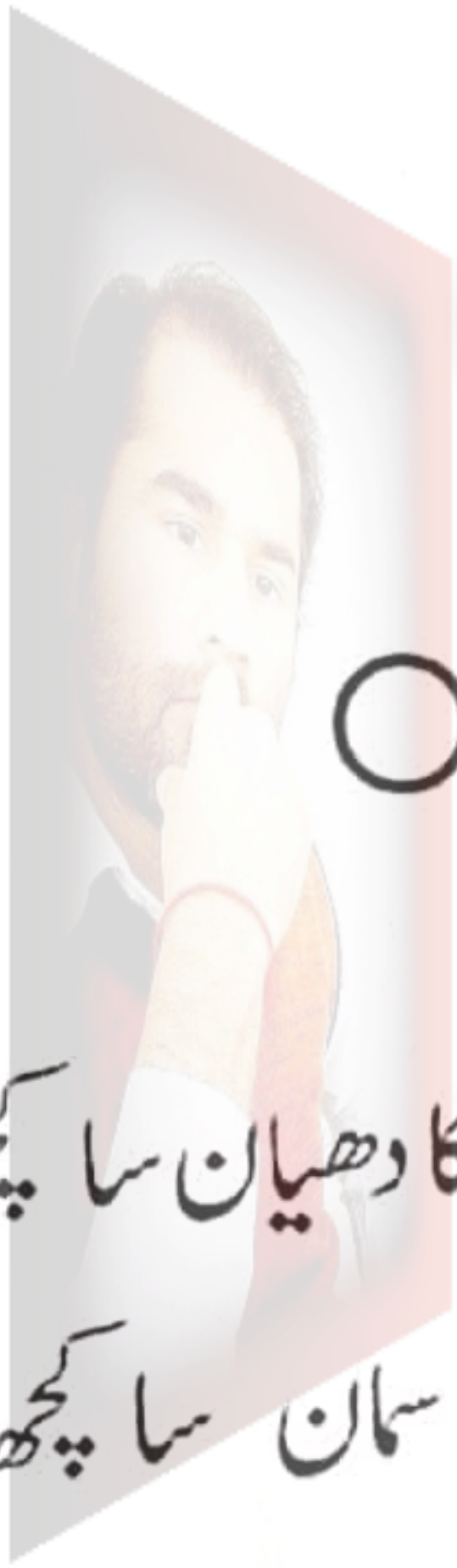
جب ہمیں اس کا دھیان سا کچھ تھا
سر پہ اک آسمان سا کچھ تھا

جو ہوا اب مری بلا جانے
پھر بھی وہ امتحان سا کچھ تھا

اب نہیں ہے تو یاد آتا ہے
شخص جو مہربان سا کچھ تھا

اے مرے رہ نوردِ شوق، اے دل
جو ترا کاروان سا کچھ تھا؟

جو بھی حاصل وصول ہم نے کیا
کیا وہ سب رایگان سا کچھ تھا؟

اڑ گیا ہے اڑان ہی میں کہیں
جو پروں میں اُڑان سا کچھ تھا

جس سبب سے تھی زندگی ممکن
خواب تھا یا گمان سا کچھ تھا

سب بہم تھے رواں مگر پھر بھی
جانے کیا درمیان سا کچھ تھا

............

○



یہ یقیں، یہ گماں ہی ممکن ہے
تجھ سے ملنا یہاں ہی ممکن ہے

خواب اک ممکن و میسّر کا
گرچہ اس کا بیاں ہی ممکن ہے



بے حد و بے حساب شوق میں بھی
قصدِ کوئے بتاں ہی ممکن ہے



تنگنائے جہانِ ظاہر میں
یہ زمیں، یہ زماں ہی ممکن ہے

حد سے حد اس رہِ ہزیمت میں
پرسشِ رہرواں ہی ممکن ہے

آتشِ دل پہ ڈالنے کے لیے
ریگِ راہِ رواں ہی ممکن ہے

سرحدِ ممکنات سے آگے
سر پہ اک آسماں ہی ممکن ہے

آن بیٹھے کہ جی لگانے کو
صحبتِ دوستاں ہی ممکن ہے

عرصۂ زندگی میں تیری مری
صرف اک داستاں ہی ممکن ہے

کیا تماشا ہے یاں اُٹھانے کو
ایک بارِ گراں ہی ممکن ہے

...........

O

رنگِ دنیا سے وراخوابِ تمنا سے الگ
آنکھ اِک اور بھی ہے چشمِ تماشا سے الگ

وقت پتھر کی طرح ٹھوکریں کھاتا ہے یہاں
قِصّۂ خاک ہے رُودادِ زمانہ سے الگ

ہم کہ خاموش بھی ہیں، تیرے طلب گار بھی ہیں
اور یہ وصف کہ ہے خوئے تقاضا سے الگ

کام کچھ ہوتے ہی جاتے ہیں، کرو یا نہ کرو
کاوش و ہمت و اسباب و ارادہ سے الگ

گردِ دنیا بھی یہیں، گردِ محبت بھی یہیں
راہ ہم ڈھونڈ چکے ہیں، رہِ دنیا سے الگ

کوئی ان دیکھے قدم روندتے رہتے ہیں ہمیں
گھاو ہیں اور بہت، زخمِ نظارہ سے الگ

رقص میں ہوں تو بھلا ہاتھ کہاں آتے ہیں
ہمیں زنجیر کرو، وحشت و سودا سے الگ

ہوش جاتا نہیں، اُڑتا ہی چلا جاتا ہے
جامِ افسوس کہ ہے بادہ و مینا سے الگ

............

کچھ بھی نہیں رہا یہاں، آپ سے کیا چھپایئے
دل ہی میں جب لہو نہیں، شور کہاں مچایئے

دوری فریب ہے مگر، دوری میں راستہ بھی ہے
بیٹھے رہیں گے کب تلک، اب اُنھیں ڈھونڈ لایئے

سر میں جو گونجتی بھی ہے، ہونٹوں پہ ڈولتی بھی ہے
کس کو ہے تابِ غم یہاں، کس کو یہ دھن سنایئے

سرحدِ شوق سے پرے، شام کی بستیاں بھی ہیں
جب یہ سفر تمام ہو، آگے کدھر کو جائیے

ڈھل گئی رات دیکھتے، راہ رُخِ اُمید کی
اب ہمیں نیند آ گئی، اب نہ ہمیں ستائیے

آنکھیں تھیں چاہتوں بھری، چہرے جو مہربان تھے
اب وہ نظر نہ آئیں گے، اب اُنھیں بھول جائیے

جان ہے تو جہان ہے، دل ہے تو آرزو بھی ہے
عشق بھی ہو رہے گا پھر، جان ابھی بچائیے

کھو گئے خوابِ چشم و لب، تابِ طلب نہیں رہی
دل میں وہ زور اب کہاں، اب یہ دکاں بڑھائیے

............

اے تُو! کہ تیرے واسطے کیا کیا نہیں کیا
اور تو نے میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا

کچھ ہم کو بھی دماغِ تمنا نہیں تھا' اور
کچھ اُس نے بھی اِدھر رخِ زیبا نہیں کیا

دیکھا کہ اس کو حرمتِ لب تک رہی عزیز
ہم نے پھر اپنے عشق کو رُسوا نہیں کیا

اس کی گلی، وہ پاؤں کی زنجیر تھی کہ بس
سو ہم نے پھر کہیں کا ارادہ نہیں کیا

ہاں خود فریبیوں سے مفر ہے کسے، مگر
ہم نے کسی بھی اور سے دھوکا نہیں کیا

رقصِ جنوں صِلہ تھا، سو مصروف ہم رہے
عُشّاق نے وگرنہ یہاں کیا نہیں کیا

زمیں نہیں یہ مری، آسماں نہیں میرا
متاعِ خواب بجز کچھ یہاں نہیں میرا

یہ اونٹ اور کسی کے ہیں، دشت میرا ہے
سوار میرے نہیں، ساربان نہیں میرا

مجھے تمھارے تیقّن سے خوف آتا ہے
کہ اس یقین میں شامل گماں نہیں میرا

میں ہو گیا ہوں خود اپنے سفر سے بیگانہ
کہ نیند میری ہے، خوابِ رواں نہیں میرا

تو آب و خاک سے بچ کر کدھر کو جاتا میں
دوامِ وصل ہے باقی نشاں نہیں میرا

پھر ایک دن اسی مٹّی کو لوٹ جاؤں گا
گریز تجھ سے رہِ رفتگاں نہیں میرا

صدائے شہرِ گزشتہ ابھی بلاتی ہے
گو اب عزیز کوئی بھی، وہاں نہیں میرا

............
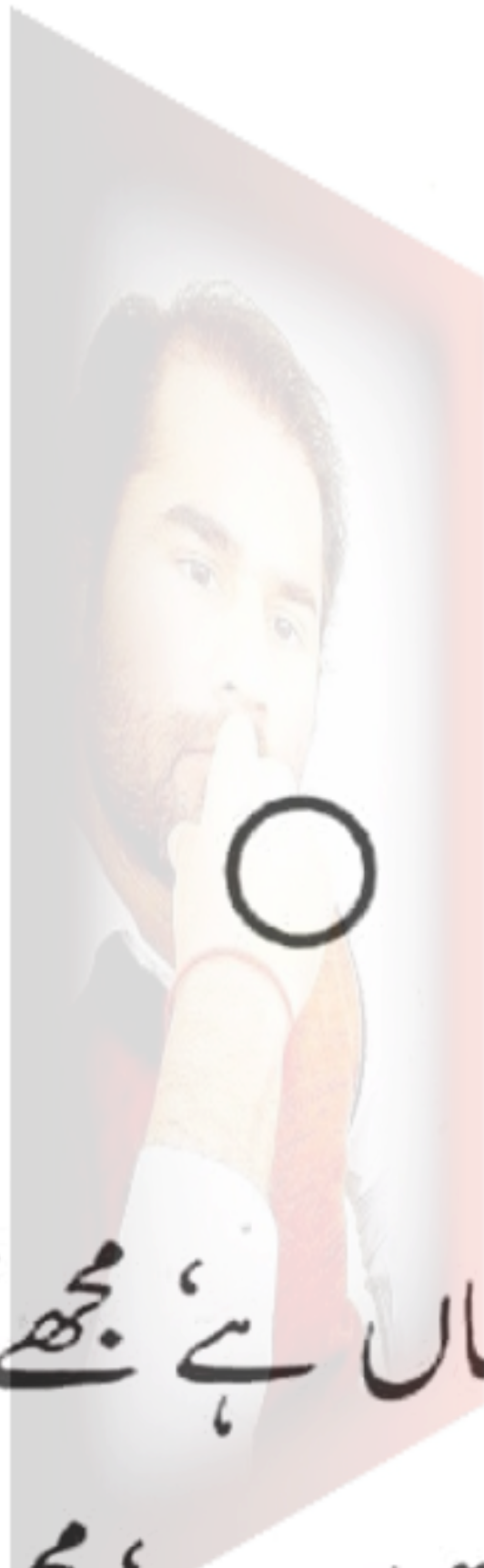
یقین ہے کہ گماں ہے، مجھے نہیں معلوم
یہ آگ ہے کہ دھواں ہے، مجھے نہیں معلوم

یہ ہر طرف ہے کوئی محفلِ طرب برپا
کہ بزمِ غم زدگاں ہے، مجھے نہیں معلوم

لیے تو پھرتا ہوں اک موسمِ وجود کو میں
[illegible]

وہ رنگِ گل تو اسی خاک میں گھلا تھا کہیں
مگر مہک وہ کہاں ہے، مجھے نہیں معلوم

خبر تو ہے کہ یہیں قریۂ ملال بھی ہے
یہ کون محوِ فغاں ہے، مجھے نہیں معلوم



میں تجھ سے دور اُسی دشتِ نارسی میں ہوں گم
اُدھر تو نوحہ کناں ہے، مجھے نہیں معلوم



یہ کشمکش جو مَن و تُو کے درمیاں ہے، سو ہے
میانِ سود و زیاں ہے، مجھے نہیں معلوم



یہ داغِ عشق جو مٹتا بھی ہے، چمکتا بھی ہے
یہ زخم ہے کہ نشاں ہے، مجھے نہیں معلوم

گزرتا جاتا ہوں اک عرصۂ گریز سے میں
یہ لامکاں کہ مکاں ہے، مجھے نہیں معلوم

رواں رواں تو ہے یہ جوئے زندگی ہر دم
مگر کدھر کو رواں ہے، مجھے نہیں معلوم

یہ کوئے خاک ہے یا پھر دیارِ خواب کوئی
زمین ہے کہ زماں ہے، مجھے نہیں معلوم

○

آہ و فریاد سے نکلتا ہوں
اب تری یاد سے نکلتا ہوں

اپنی خوشبو کا ہے فسوں مجھ پر
بوئے ہم زاد سے نکلتا ہوں
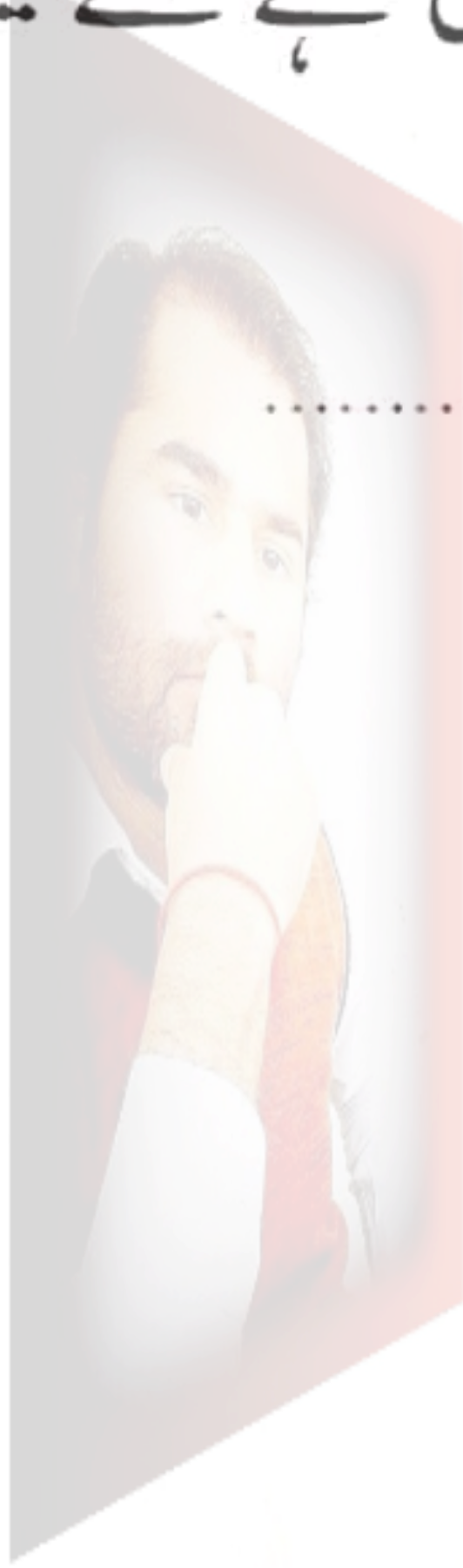
منکرِ لطف و التفات ہوں اب
دامِ صیّاد سے نکلتا ہوں

شاد کامی سے کام ہے کچھ دن
دلِ ناشاد سے نکلتا ہوں

پھیل جانے کو مثلِ بوئے نشاط
کنجِ برباد سے نکلتا ہوں

خاک جاتی ہے اب عدم کی طرف
بزمِ ایجاد سے نکلتا ہوں

شور کے درمیاں سے اٹھتا ہوا
اب اِس افتاد سے نکلتا ہوں

اور پھر ڈولتا ہی رہتا ہوں
کیسی بنیاد سے نکلتا ہوں

شہر رفتہ میں گھر بنانے کو
کوئے آباد سے نکلتا ہوں

ڈھونڈ اب زیبِ داستاں کوئی اور
تیری رُوداد سے نکلتا ہوں

دیکھ آتا ہوں پیش منظر بھی
یہ جو مابعد سے نکلتا ہوں

چھوڑتا ہوں یہ آب و خاک، اور اب
آتش و باد سے نکلتا ہوں

اب کہیں کا نہ رہ سکوں شاید
قریۂ یاد سے نکلتا ہوں

ہمیں خبر نہیں کچھ، کون ہے، کہاں کوئی ہے
ہمیشہ شاد ہو، آباد ہو، جہاں کوئی ہے

پرے فلک سے کوئی ہے بھی یا نہیں ہے مگر
یہ خاک اڑاتا ہوا زیرِ آسماں کوئی ہے

جگہ نہ چھوڑے کہ سیلِ بلا ہے تیز بہت
اڑا پڑا ہی رہے اب، جہاں تہاں کوئی ہے

فشارِ گریہ کسی طور بے مقام نہیں
دیارِ غم ہے کہیں پر، پسِ فغاں کوئی ہے

وہ کوئی خدشہ کہ ہے وہم، خواب ہے کہ خیال
کہ ہو نہ ہو مرے دل، اپنے درمیاں کوئی ہے

کبھی تو ایسا ہے جیسے کہیں پہ کچھ بھی نہیں
کبھی یہ لگتا ہے جیسے یہاں وہاں کوئی ہے

کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے فرد فرد ہیں ہم
یہ اور بات ہمارا ابھی کارواں کوئی ہے





کہیں پہنچنا نہیں ہے اسے، مگر پھر بھی
مثالِ بادِ بہاراں، رواں دواں کوئی ہے



ہُوا ہے اپنے سفر سے، حضر سے بیگانہ
وہیں وہیں پہ نہیں ہے، جہاں جہاں کوئی ہے



چھلک جو اٹھتی ہے یہ آنکھ فرطِ وصل میں بھی
تو سرخوشی میں ابھی رنجِ رائگاں کوئی ہے

شکستِ دل سے نہ کیا، راہِ عشق ترک نہ کر
یہ دیکھ کیا کہیں پروردۂ زیاں کوئی ہے؟

اب اس نگاہِ فسوں کار کا قصور ہے کیا
ہمیں دکھاؤ اگر زخم یا نشاں کوئی ہے



کہیں پہ آج بھی وہ گھر ہے ہنستا بستا ہوا
یہ وہم سا ہے ترے دل کو یا گماں کوئی ہے



جوارِ قریۂ یاراں میں جا نکلتا ہوں
کہ جیسے اب بھی وہاں میرا مہرباں کوئی ہے

قصے سے ترے، میری کہانی سے زیادہ
پانی میں ہے کیا اور بھی، پانی سے زیادہ

اس خاک میں پنہاں ہے کوئی خوابِ مسلسل
ہے جس میں کشش عالمِ فانی سے زیادہ

نخلِ گلِ ہستی کے گل و برگ عجب ہیں
اُڑتے ہیں یہ اوراقِ خزانی سے زیادہ

ہر رخ ہے کہیں اپنے خدوخال سے باہر
ہر لفظ ہے کچھ اپنے معانی سے زیادہ

وہ حُسن ہے کچھ حُسن کے آزار سے بڑھ کر
وہ رنگ ہے کچھ اپنی نشانی سے زیادہ

ہم پاس سے تیرے، کہاں اٹھ آئے ہیں، یہ دیکھ
اب اور ہو کیا نقل مکانی سے زیادہ

اس شب میں ہو گریہ کوئی تاریکی سے گہرا
ہو کوئی مہک رات کی رانی سے زیادہ

ہم کُنجِ تمنا میں رہیں گے کہ ابھی تک
ہے یاد تری، یاد دہانی سے زیادہ

اب ایسا زبوں بھی تو نہیں حال ہمارا
ہے زخمِ عیاں ، دردِ نہانی سے زیادہ

○



ہمارے بیچ اگرچہ رہا نہیں کچھ بھی
مگر یہ دل ہے، ابھی مانتا نہیں کچھ بھی

یہ کیسی دھول سی راہوں میں اڑتی پھرتی ہے
تو اے مسافرِ جاں کیا بچا نہیں کچھ بھی؟

بس ایک منظرِ خالی میں اونگھ لیتا ہے
وہ خوش نظر ہے مگر دیکھتا نہیں کچھ بھی

ہم اپنے اپنے دل و جاں کی خیر مانگتے ہیں
یہ عجز کچھ بھی نہیں ہے، انا نہیں کچھ بھی

ہم اُس کے غم کو ان آنکھوں میں لے کے پھرتے ہیں
مگر وہ شخص ہمیں جانتا نہیں کچھ بھی

کہیں یہ ہو کہ نہ ہو عزتِ گنہ گاراں
مگر یہاں کوئی تیرے سوا نہیں کچھ بھی

تو بول اٹھتا ہے، ہم کو بھلا بھی لگتا ہے
مگر تُو یار مرے سوچتا نہیں کچھ بھی

گماں تو خیر محبت کا تھا، پر اب اس سے
سوائے رنجِ طلب، واسطہ نہیں کچھ بھی

ہمارے حال پہ تم کو ملال تک بھی نہیں
تو کیا جو ربط ہمارا تھا، تھا نہیں کچھ بھی

کبھی جو آؤ تو ہم کو جو تم سے کہنی ہے
یونہی سی بات ہے اب، مدعا نہیں کچھ بھی

............

جو بھی یک جا ہے، بکھرتا نظر آتا ہے مجھے
جانے یوں ہے بھی، کہ ایسا نظر آتا ہے مجھے

چشمِ وا میں تو وہی منظرِ خالی ہے، جو تھا
موند لوں آنکھ تو کیا کیا نظر آتا ہے مجھے

مائلِ عرضِ تمنا ہے، نہ ہے وقفِ ملال
اے مرے دل، تو ٹھہرتا نظر آتا ہے مجھے

پسِ نظارہ کوئی خوابِ گریزاں ہی نہ ہو
دیکھنے میں تو تماشا نظر آتا ہے مجھے

باندھ لوں رختِ سفر؟ لوٹ چلوں گھر کی طرف
تیری جانب سے اشارہ نظر آتا ہے مجھے



تجھے کیونکر ہو یہ معلوم مرے ماہِ تمام
داغِ دل کیسے ستارہ نظر آتا ہے مجھے



کشتیِ جاں یہی اک آدھ بھنور اور ہے بس
کہیں نزدیک کنارہ نظر آتا ہے مجھے



دیکھنے دیکھنے میں فرق ہوا کرتا ہے
تمھی بتلاؤ کہ کیسا نظر آتا ہے مجھے

یہ جو ہم سَر تری چوکھٹ سے لگائے ہوئے ہیں
یہی سمجھو کہ زمانے کے ستائے ہوئے ہیں

ہم نے اس دل کو کہیں اور لگایا ہوا ہے
اور یہ ہاتھ کہیں اور اٹھائے ہوئے ہیں

تجھے دیکھوں تو مجھے یاد یہ کون آتا ہے
تو نے یہ رنگ بھلا کس کے چرائے ہوئے ہیں

کارِ دنیا نے ہمیں مہلتِ یک خواب نہ دی
سو کہیں کھوئے ہوئے ہیں کہیں پائے ہوئے ہیں

اور ہی خاک ہو شاید جو پتا بتلائے
ہم کہ اس لوحِ جہاں سے تو مٹائے ہوئے ہیں

کس لیے یاد دلاتے ہو ابھی رہنے دو
کیا ہوا ہم جو کوئی بات بھلائے ہوئے ہیں

کام جو ہم سے نہیں ہوگا کیے جاتے ہیں
ہم سے اٹھتا جو نہیں بوجھ، اٹھائے ہوئے ہیں

ہم ہی کچھ گوش بر آواز نہیں تھے، ورنہ
تم نے پہلے بھی یہی گیت سنائے ہوئے ہیں

دیکھنے کی تجھے کچھ دل میں ہے حسرت بھی ابھی
اور یہ بھی کہ ترے شہر میں آئے ہوئے ہیں
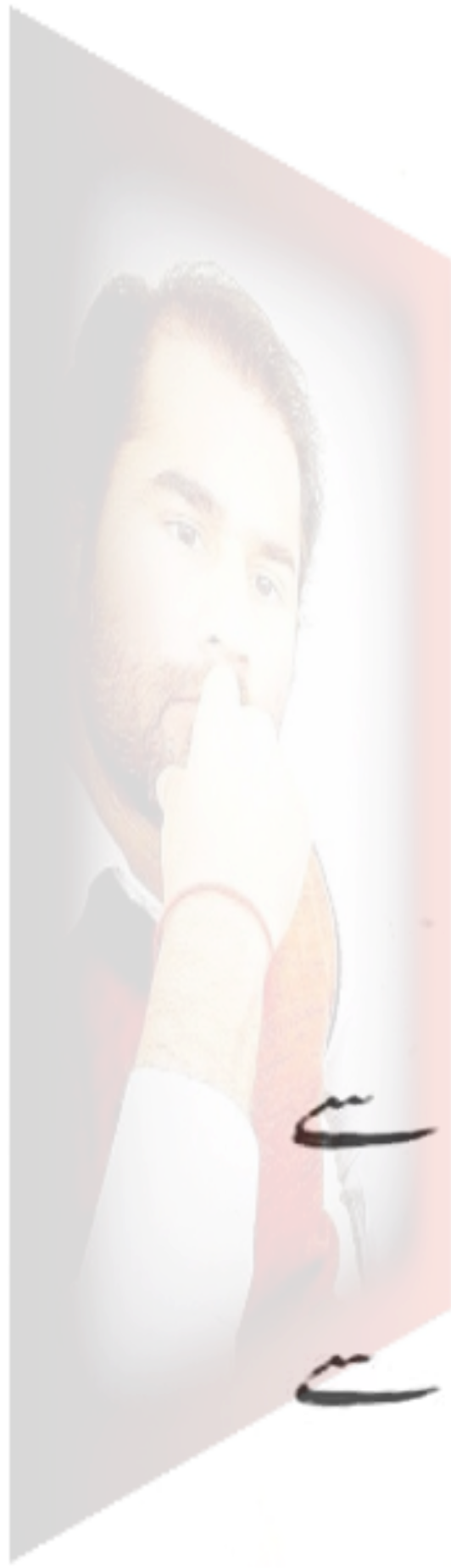
بھر پائے ہم ایسی زندگی سے
چھٹتی نہیں جان بے کلی سے

سب پیار سے مجھ کو دیکھتے ہیں
میں تکتا ہوں سب کو بے بسی سے

کب غم نے نہیں اجاڑ رکھا
کب مرتے نہیں رہے خوشی سے

سن رکھی ہیں ہم نے ساری باتیں
ڈرتے ہیں تمھاری ان کہی سے

تم کیسے چراغِ جاں ہو میرے
بجھ جاتے ہو، دل کی روشنی سے

اپنے سے نباہ کب ہے آساں
کیا ربط بڑھائیں اجنبی سے

ہم دل سے سمجھتے، سوچتے ہیں
کچھ کام نہیں ہے دل لگی سے

اپنا جو نہیں رہا ہے کوئی
رکھی ہے بنا کے ہر کسی سے

سرکش بھی جو ہوں تو کیا برا ہے
کیا مل گیا ہم کو بندگی سے

.............

گریزاں تھا مگر ایسا نہیں تھا
یہ میرا ہم سفر ایسا نہیں تھا

یہاں مہماں بھی آتے تھے، ہَوا بھی
بہت پہلے یہ گھر ایسا نہیں تھا

یہاں کچھ لوگ تھے، اُن کی مہک تھی
کبھی، یہ رہگذر ایسا نہیں تھا

رہا کرتا تھا جب وہ اس مکان میں
تو رنگِ بام و در ایسا نہیں تھا

بس اک دُھن تھی نبھا جانے کی، اس کو
گنوانے میں ضرر ایسا نہیں تھا

مجھے تو خواب ہی لگتا ہے اب تک
تو کیا تھا وہ اگر ایسا نہیں تھا

پڑے گی دیکھنی دیوار بھی اب
کہ یہ سودائے سر ایسا نہیں تھا

خبر لوں جا کے اس عیسیٰ نفس کی
وہ مجھ سے بے خبر ایسا نہیں تھا

نہ جانے کیا ہوا ہے کچھ دنوں سے
کہ میں اے چشمِ تر ایسا نہیں تھا

اِدھر اب دیکھتا تک بھی نہیں ہے
وہ میرا خوش نظر ایسا نہیں تھا

یونہی نمٹا دیا ہے جس کو تو نے
وہ قِصّہ مختصر ایسا نہیں تھا



○

میں اپنے خوابِ تمنا سے کیا نکلتا ہوں
جوارِ قریۂ غفلت میں جا نکلتا ہوں

گو یہ مشکل گھڑی ہے، سو جاؤ
نیند جب آ رہی ہے، سو جاؤ

کون آئے گا پوچھنے کے لیے
سب کو اپنی پڑی ہے، سو جاؤ

سب کو اب کام سے ہے کام یہاں
تم کو کیا بے کلی ہے، سو جاؤ

دن تھے جب جاگنے کے، جاگتے تھے
اب یہ دیوانگی ہے، سو جاؤ

نیند میں جو جگائے رکھتی تھی
آنکھ وہ سو گئی ہے، سو جاؤ

گھپ اندھیرے میں خوف آئے گا
کچھ ابھی روشنی ہے، سو جاؤ

جو بھی ہونا ہے ہو رہے گا، تو پھر
امن یا ابتری ہے، سو جاؤ

تم جہاں دن گزار آئے، وہ اب
کوئے بے گانگی ہے، سو جاؤ

جس کے آگے ٹھہر سکے تھے نہ ہم
وہ ہوا پھر چلی ہے، سو جاؤ

خود ہی کہتے ہو، خود ہی سنتے ہو
کیسی دیوانگی ہے، سو جاؤ

وسوسہ دل سے یوں نہ جائے گا
رات اب دو گھڑی ہے، سو جاؤ

خود سے ہر دم الجھتے رہتے ہو
کیا یہی زندگی ہے، سو جاؤ

تھک بھی جاتا ہے آدمی آخر
رنج ہے یا خوشی ہے، سو جاؤ

دن بھی آئے گا جاگنے والا
رات اب ہو گئی ہے سو جاؤ

............

کچھ کام نہیں ہے یہاں وحشت کے برابر
سو تم ہمیں غم دو کوئی ہمت کے برابر

کب لگتا ہے جی راہِ سہولت میں ہمیشہ
اور ملتا ہے کب رنج، ضرورت کے برابر

آسایش و آرام ہو، یا جاہ و حشم ہو
کیا چیز یہاں پر ہے محبت کے برابر

گنجایشِ افسوس نکل آتی ہے ہر روز
مصروف نہیں رہتا ہوں، فرصت کے برابر

بھر لائے ہیں ہم آنکھ میں رکھنے کو مقابل
اک خوابِ تمنا، تری غفلت کے برابر

رکھ دیں گے ترے پاؤں میں، ہم موج میں آ کر
دنیا ہے کہاں جان کی قیمت کے برابر

پھر کشمکشِ سود و زیاں، کارِ زیاں ہے
جب جیت بھی ٹھہری ہے، ہزیمت کے برابر

جینے میں جو احساسِ تفاخر ہے، کہاں ہے
جیتے چلے جانے کی ندامت کے برابر
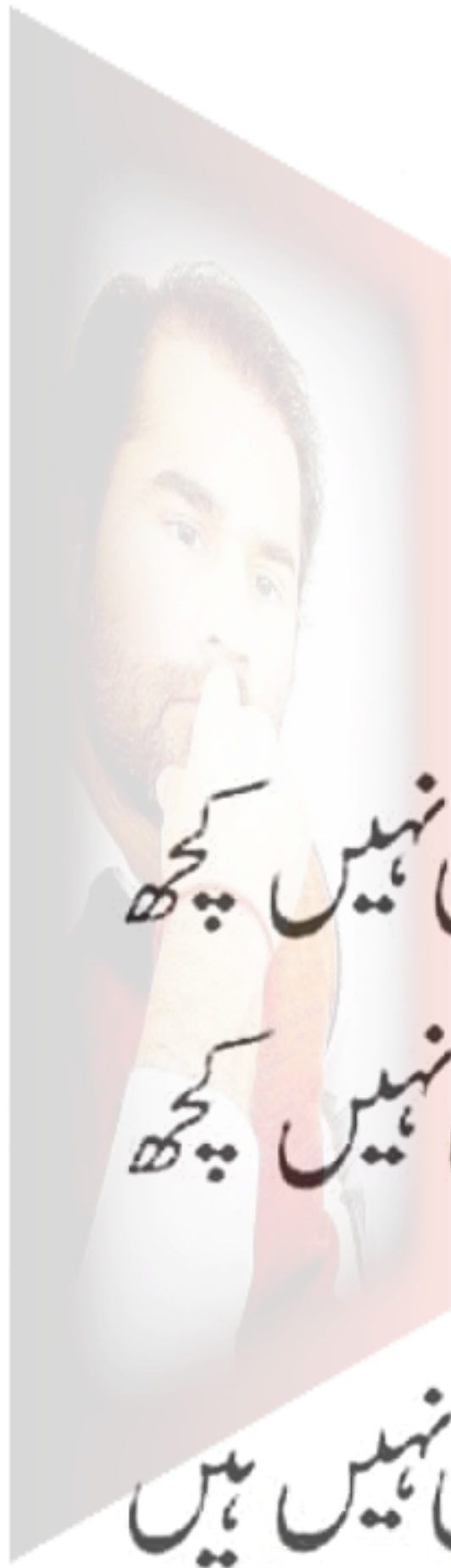
رُسوائی نہیں کچھ بھی تو شہرت بھی نہیں کچھ
دیکھو تو یہاں ذلّت و عزت بھی نہیں کچھ

کچھ کام ہمارے یہاں ہوتے بھی نہیں ہیں
کچھ یوں ہے کہ ہم کو یہاں عجلت بھی نہیں کچھ

ایسا بھی نہیں کچھ کہ کریں ترکِ تعلق
ورنہ تو یہ طے ہے کہ محبت بھی نہیں کچھ

ہر چند ہوئے تنگ ہم اس شورشِ دل سے
پر نام سے تیرے ہمیں وحشت بھی نہیں کچھ

کچھ لوگ بھی خود مست و کم آمیز ہوئے ہیں
اور یہ بھی کہ پہلی سی مروّت بھی نہیں کچھ

یکسانیِ نظارہ سے جی بھر بھی گیا ہے
اُس رُخ پہ گزشتہ کی وہ رنگت بھی نہیں کچھ

اب سرد ہُوا آنکھ میں وہ شعلۂ رنجش
سو دل میں کہیں گردِ کدورت بھی نہیں کچھ

کچھ بارِ محبت بھی بڑھا جاتا ہے ہر دم
یہ بوجھ اُٹھانے کی وہ ہمت بھی نہیں کچھ

کچھ رات کا جادو بھی لیے پھرتا ہے ہر سُو
اور ہم کو بہت سونے کی عادت بھی نہیں کچھ

وہ چشمِ فسوں کار گریزاں بھی ہے ہم سے
اب لطف و عنایت کی ضرورت بھی نہیں کچھ

ہر چیز یہاں پر ہے فراموشی کی زد پر
تم بھول گئے ہم کو تو حیرت بھی نہیں کچھ

جینے میں وہ پہلی سی سہولت بھی نہیں ہے
زندہ ہیں اگر، اس میں خجالت بھی نہیں کچھ

ہیں خاک تو پھر خاک سے نسبت تو رہے گی
پیوندِ زمیں ہیں، تو ہزیمت بھی نہیں کچھ
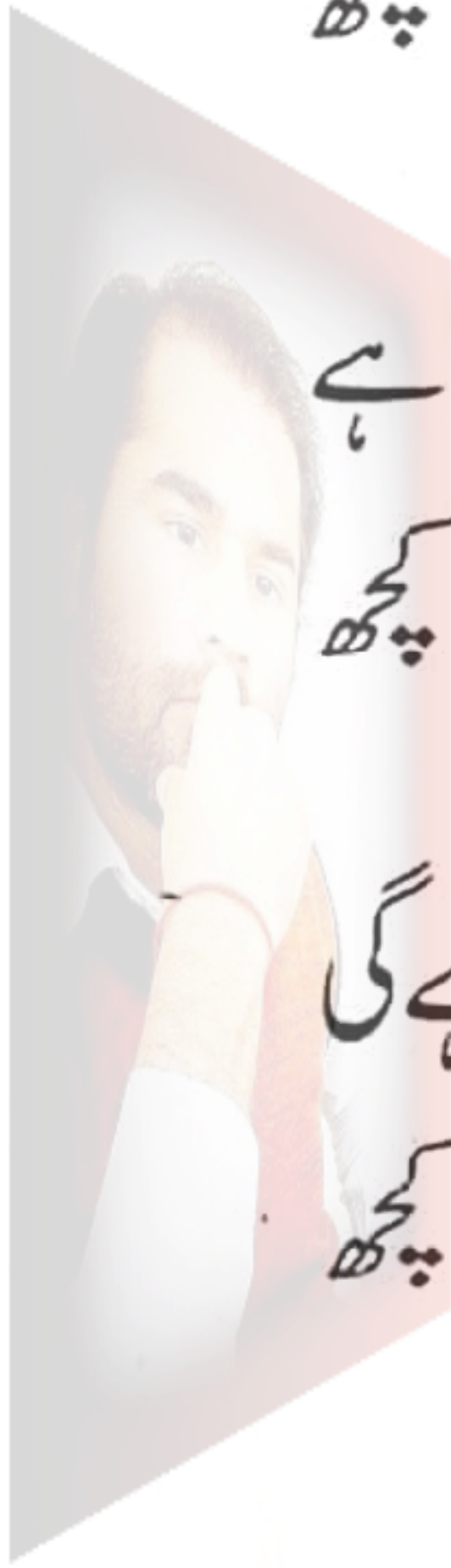
○

اب کوئی بام پر رہے گا کہاں
تو پریشاں نظر رہے گا کہاں

خاک تیری جہاں مقیم ہوئی
یہ جو گھر ہے تو گھر رہے گا کہاں

بے ٹھکانہ بکھر رہیں گے ہم
پھر حضر اور سفر رہے گا کہاں

یاں جو اک بار بھی نہ رہ پایا
پھر وہ بارِ دِگر رہے گا کہاں

وہ اُجالے، وہ صبحیں روٹھ گئیں
اے مرے خوش نظر، رہے گا کہاں

سرخوشی کام آئے گی کب تک
آہ میں بھی اثر رہے گا کہاں

کام لے کوئی اپنی وحشت سے
پھر یہ سودا، یہ سر رہے گا کہاں

مِٹ رہے گی کبھی یہ بے خوفی
اور جو دل میں ہے ڈر، رہے گا کہاں

بند ہے اب دکانِ گریہ بھی
تو سرِ رہگزر رہے گا کہاں

منزلوں منزلوں بھٹکتا ہے
جانے یہ دل ٹھہر رہے گا کہاں

خاک زادوں کو روندلے کچھ دن
پھر ترا کروفر رہے گا کہاں

حالِ عُشاق و خوابِ دل زدگاں
تیرے پیشِ نظر رہے گا کہاں

بند ہے اب وہ گھر، وہ دروازہ
بول اب کے تو مر رہے گا کہاں

چشمِ بیمار سو گئی جس دم
تو مرے چارہ گر، رہے گا کہاں

............

۱
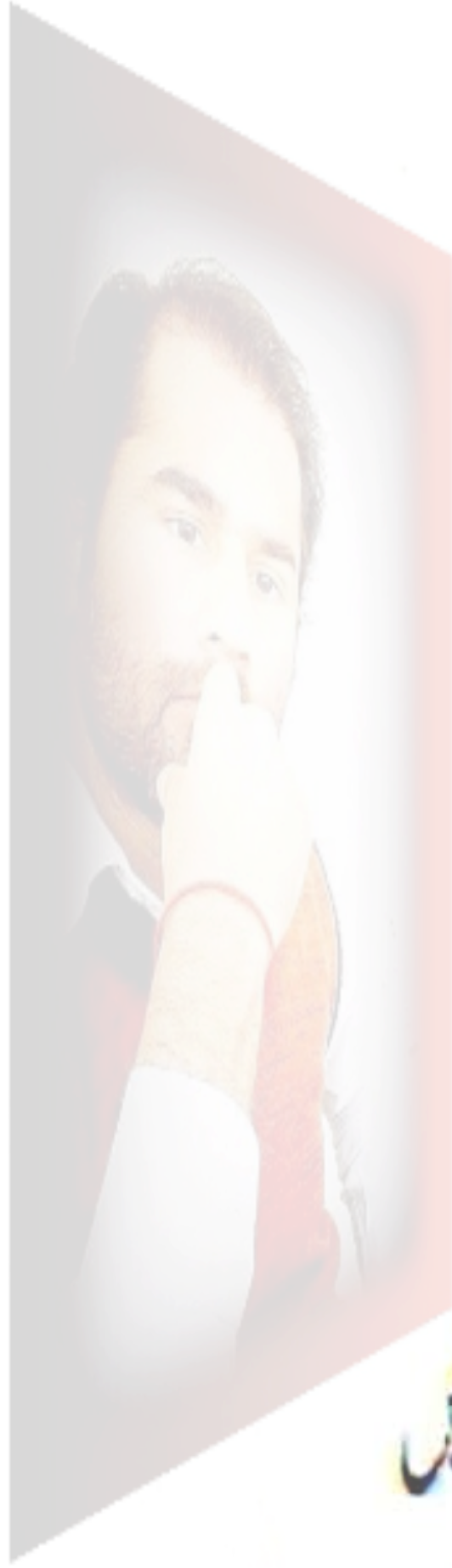
دل میں کیا تھا جو کھو گیا ہے کہیں
میرا نقصان ہو گیا ہے کہیں

وہ تری کھوج میں رہا اور پھر
غالباً تجھ کو رو گیا ہے کہیں

ہار بانہوں کے ساتھ لایا تھا

تیری آواز بھی نہیں سنتا
کیا مرا بخت سو گیا ہے کہیں

رنگ وہ لے گیا مگر مجھ میں
اپنی خوشبو سمو گیا ہے کہیں

یوں تہی دست و دل گرفتہ نہ تھا
کچھ نہ کچھ مجھ کو ہو گیا ہے کہیں

ہم رہِ صد ملال ہے وہ کبھی
اور ہر رنج دھو گیا ہے کہیں

خواب جو نیند میں بھی تھا بیدار
آخرِ کار سو گیا ہے کہیں

O

پسِ ہر رنجِ گماں، زخمِ یقیں دیکھا ہے
رایگاں ہم نے کسی غم کو نہیں دیکھا ہے

کیا تمھیں خوابِ تمنا کی حقیقت معلوم
تم نے کب اشکِ طلب، داغِ جبیں دیکھا ہے

گھیر لیتا ہے کہیں اِک شبِ رفتہ کا ملال
ورنہ کیا تم نے کبھی ہم کو غمیں دیکھا ہے؟

کیا سے کیا ہو گئے ہم، بدلی نہیں یہ دُنیا
پھر وہی عکسِ فلک، رنگِ زمیں دیکھا ہے

ساتھ رہتے ہوئے پردہ ہی رہا ہے ایسا
ہم کو لگتا ہی نہیں اُس کو کہیں دیکھا ہے

ہم جو کہتے ہیں بھلا تم کو سمجھ کیوں آئے
تم نے ایسے کبھی دُنیا کو نہیں دیکھا ہے

کیا کبھی ترکِ مسافت کا خیال آیا تمھیں
تم نے دیکھا وہ مکاں؟ اس کا مکیں دیکھا ہے!

پھر اسی غم اسی مٹّی کی طرف لوٹ چلوں
میں نے یہ خواب ستاروں کے قریں دیکھا ہے

ایک سایہ ہی رہا ہے کہیں بینائی پر
دیکھنے کو تو بہت اپنے تئیں دیکھا ہے

ڈھونڈتے ڈھونڈتے اب خاک ہوئے جاتے ہیں
کوئی بتلاؤ اگر اُس کو کہیں دیکھا ہے

اک فراموش کہانی میں رہا
میں جو اُس آنکھ کے پانی میں رہا

رُخ سے اُڑتا ہوا وہ رنگِ بہار
ایک تصویر پرانی میں رہا

میں کہ معدوم رہا صورتِ خواب
پھر کسی یاد دہانی میں رہا

ڈھنگ کے ایک ٹھکانے کے لیے
گھر کا گھر نقلِ مکانی میں رہا

میں ٹھہرتا گیا رفتہ رفتہ
اور یہ دل اپنی روانی میں رہا

وہ مرا نقشِ کفِ پائے طلب
عہدِ رفتہ کی نشانی میں رہا

میں کہ ہنگامۂ یک خواب لیے
کوئی دن عالمِ فانی میں رہا

............

O

سر پہ اب سائباں نہیں ہے تو کیا
تو اگر مہرباں نہیں ہے تو کیا

تم کو کیا مل گیا، اِدھر ہم کو
فکرِ سود و زیاں نہیں ہے تو کیا

وہ مکاں، وہ گلی، وہ لوگ تو ہیں
کوئی اپنا، وہاں نہیں ہے تو کیا

یوں بھی کس شے کو ہے دوام یہاں
تیرا غم، جاوداں نہیں ہے تو کیا

جو مرے روز و شب کا قصّہ ہے
وہ تری داستاں نہیں ہے تو کیا



چیختا پھر رہا ہے، جو ہے یہاں
میرے بس میں زباں نہیں ہے تو کیا

ہے تو سب کچھ یہاں پہ وہم و گماں
اور وہم و گماں نہیں ہے تو کیا



حالِ دل کی خبر ہے تجھ کو تو پھر؟
تجھ پہ کچھ بھی عیاں نہیں ہے تو کیا

............

بس یونہی چپ ہیں، سبب کچھ بھی نہیں
پہلے کچھ تھا بھی تو اب کچھ بھی نہیں

ٹھیک ہے تہمتِ بے نامی بھی
طرۂ نام و نسب کچھ بھی نہیں

کوئی افسوس، نہ سرشاری ہے
چشمِ نم، خندۂ لب کچھ بھی نہیں

کوئی دن اور یہ سب کچھ ہے مرا
مجھے معلوم ہے، کب کچھ بھی نہیں

بے طریقہ ہی یہ دل مانگتا ہے
کچھ سلیقہ ہے، نہ ڈھب کچھ بھی نہیں

مل ہی جائے گا جو ملنا ہے ہمیں
اب خوشی ہے نہ طلب کچھ بھی نہیں

ناتوانی کا یہ ہنگامہ ہے
شورشِ غیض و غضب کچھ بھی نہیں

کوئی سنتا ہی نہیں ہے تو اے دل!
زاریِ آخرِ شب کچھ بھی نہیں

وہ بھی دیکھا جو نہ دیکھا تھا کبھی
اب جو ہو جائے، عجب کچھ بھی نہیں

پہلے کچھ تھا بھی تو کھو بیٹھے ہیں
خوب آئے ہو کہ جب کچھ بھی نہیں

.............

پایا ہے اگر کچھ اُسے کھونا بھی ہے اک دن
ہنستے جو رہے ہیں، ہمیں رونا بھی ہے اک دن

اُس آنکھ میں بھرنا ہے ابھی رنگِ تمنا
اِن اشکوں سے اُس دل کو بھگونا بھی ہے اک دن

گو داغ کچھ ایسے ہیں کہ جانے کے نہیں ہیں
ملبوسِ تمنّا ہمیں دھونا بھی ہے اک دن

فی الوقت تو ہیں عشق کی خوشبو سے ہراساں
ہاں خار کوئی دل میں چبھونا بھی ہے اک دن

جس خاک نے اک شور مچا رکھا ہے ہر سُو
اُس خاک کی چُپ میں ہمیں سونا بھی ہے اک دن

جن راہوں پہ ہم تم سے ملا کرتے ہیں ہر روز
ان راہوں میں آخر تمھیں کھونا بھی ہے اک دن



............



○
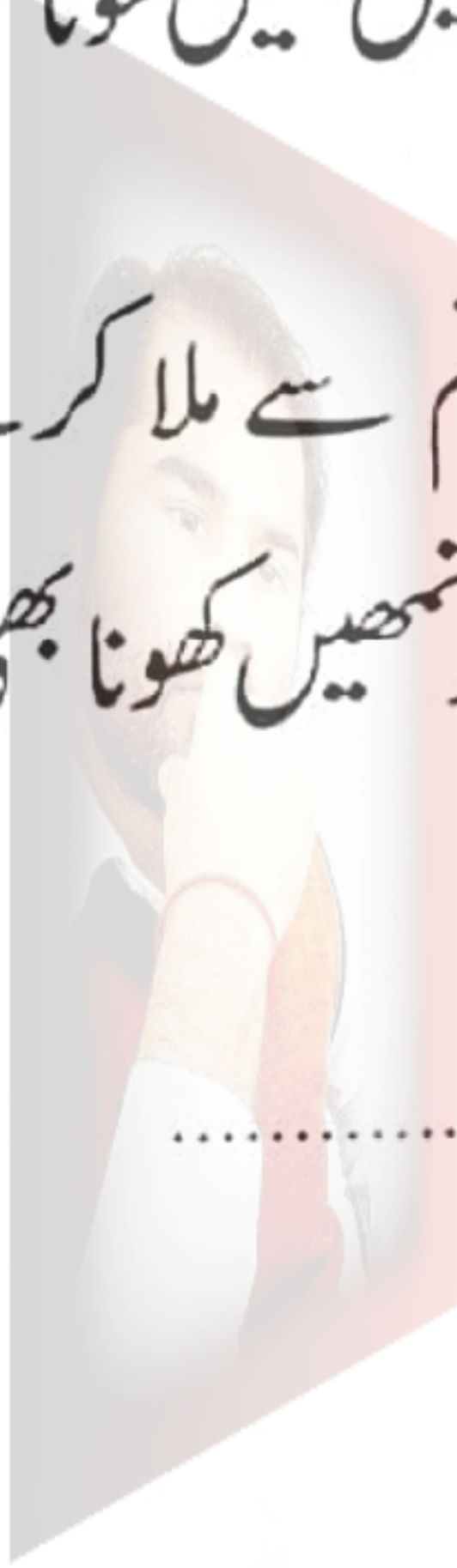
ہر دم' دمِ رخصت ہے مرے دوست' رہے یاد
ہم جاتے ہیں' جانے کا اشارہ نہیں کرتے

○

مارنے والا کوئی ہے کہ ہے مرنے والا
عکسِ ہر رنگ ہے آخر کو بکھرنے والا

جانے کس چیز کو کہتے ہیں مکافاتِ عمل
اور کرتا ہے کوئی، اور ہے بھرنے والا

خوف یوں تو ہیں بہت راہِ طلب میں لیکن
ڈٹ بھی جاتا ہے کسی موڑ پہ ڈرنے والا

چشم و دل کام میں لاؤ کہ ابھی مہلت ہے
اور کچھ دن میں یہ ساماں ہے بکھرنے والا

بے دلی، کارِ سہولت ہے، بس اب ترک کرو
اور دیکھو یہاں کچھ کام ہے کرنے والا

سیلِ گریہ ہے رواں چشم سے صحنِ دل تک
اور یہ طوفاں نہیں لگتا ہے اُترنے والا

عمر بھر ہم کو کسی یاد نے لوری دی ہے
اور یہ جھونکا بھی بالآخر ہے گزرنے والا

مان کر دیکھ لیا تجھ سے شناسائی کو
اس تعلق سے مگر اب ہوں مکرنے والا

خواب سارے ہیں بکھرنے کو، مگر خوابِ عدم
یہ فسوں کب ہے کسی سر سے اُترنے والا

تہ کرو بسترِ شب، موند لو خوابوں بھری آنکھ
دل کی لَو گل کرو، سورج ہے اُبھرنے والا

خود گزر جاؤں کہیں جاں سے، یہ طے ہے لیکن
جان لے، میں ترے ہاتھوں نہیں مرنے والا

دیارِ خواب، رہِ رفتگاں سے دیکھتا ہے
کہ جیسے کوئی مجھے آسماں سے دیکھتا ہے

ضرور ہوگا کہیں، کوئی دیکھنے والا
مگر ہمیں وہ نہ جانے کہاں سے دیکھتا ہے

یہ دیکھنا ہی بڑی بات ہے، مگر یوں ہے
کوئی یقیں سے تو کوئی گماں سے دیکھتا ہے

یہاں کسی کی نظر کا کچھ اعتبار نہیں
کہ جو بھی دیکھتا ہے درمیاں سے دیکھتا ہے

میں بہتے پانی پہ جب آنکھ گاڑتا ہوں کبھی
بہ چشمِ نم، کوئی آبِ رواں سے دیکھتا ہے

ہے مرتکز جو کوئی آنکھ ماورائے حواس
تو کوئی بابِ زمان و مکاں سے دیکھتا ہے

ہم اُٹھ بھی آئے ہیں اس باغ سے مگر وہ ہمیں
تماشہ ہائے بہار و خزاں سے دیکھتا ہے

کدھر کو کھو گیا، جو ہم رکاب تھا اس کا
کوئی سوار ہے اور کارواں سے دیکھتا ہے

عدو تو خیر وہ ہرگز نہیں، مگر بوجوہ!
مجھے وہ دوست، صفِ دشمناں سے دیکھتا ہے
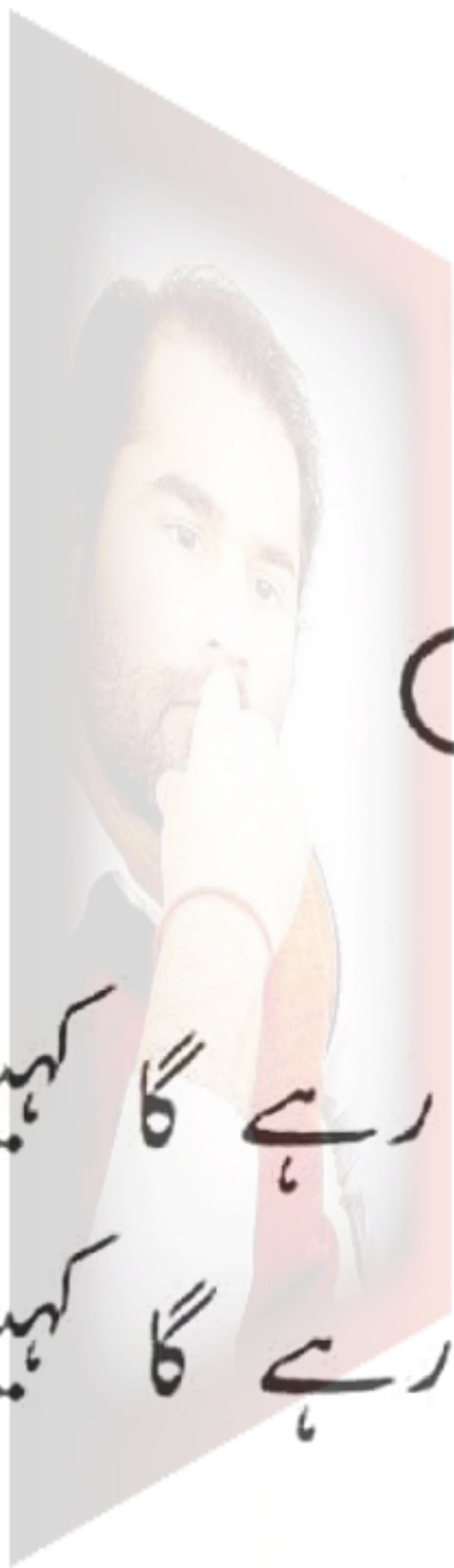
خواب تعبیر ہو رہے گا کہیں
نقش زنجیر ہو رہے گا کہیں

جو نہیں ہے کہیں گمان میں بھی
وہ تقدیر ہو رہے گا کہیں

باعثِ صد نشاط ربط ہے جو
وجہ تعزیر ہو رہے گا کہیں

دل کہ ڈالے گا ہم کو مشکل میں
اور تدبیر ہو رہے گا کہیں

ایسی عجلت، مآلِ خوابِ طلب
رنجِ تاخیر ہو رہے گا کہیں

سن کوئی دن، ابھی ہے نغمہ سرا
پھر وہ تصویر ہو رہے گا کہیں

ہنستا بستا ہوا یہ شہر نشاط
بابِ دلگیر ہو رہے گا کہیں

عمر بھر جو رہا نشانے پر
ایک دن تیر ہو رہے گا کہیں

ہے جو زندہ دلی کا ہنگامہ
غم کی تشہیر ہو رہے گا کہیں

............

○

(نذرِ مصحفی)

سرخوشی یا ملال تھا، کیا تھا
یہ جو اس دل کا حال تھا، کیا تھا

یا وہ اشکوں کا سلسلہ تھا کوئی
یا ستاروں کا جال تھا کیا تھا

وہ تو زخموں کا رنج تھا ہم کو
یہ غمِ اندمال تھا، کیا تھا؟

حشر ساماں تھی اک جھلک اُس کی

دل کو اک ہاتھ چھو کے گزرا ہے
یہ تمھارا خیال تھا' کیا تھا

جو کسی آنکھ میں لرزتا تھا
کیا وہ کوئی سوال تھا' کیا تھا



وہ نہیں تھا' پر اس کے ہونے کا
ہم کو کچھ احتمال تھا' کیا تھا



کچھ نہ اچھا کیا اگر ہم سے
وہ اگر خوش خصال تھا' کیا تھا



دمِ رخصت جو چُبھ گیا دل میں
خارِ خوابِ وصال تھا' کیا تھا

پوچھ سکتے ہیں تیری بستی میں
کیوں یہ جینا محال تھا' کیا تھا

○
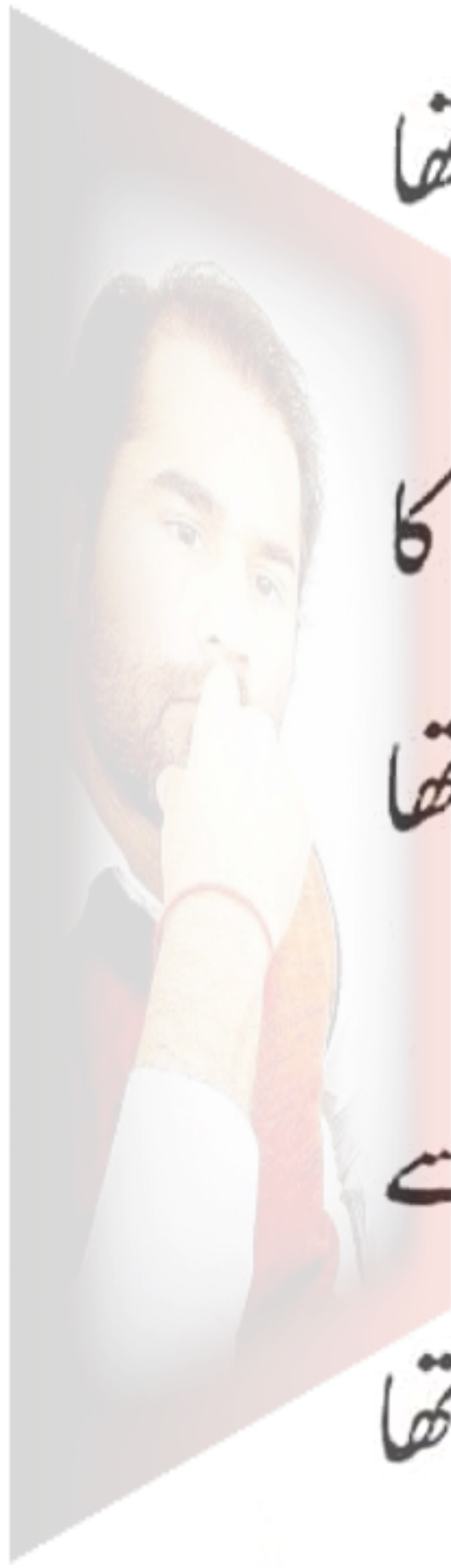
نہ صحنِ گل سے، نہ دیوار و در سے خالی ہے
مرا یہ شہر تری رہگزر سے خالی ہے

ابھی اُسے مرا رنگِ طلب پسند نہیں
ابھی وہ حسن بھی، حسنِ نظر سے خالی ہے

ابھی تو دھیان ہے اُس روئے خوشنما کی طرف
سو یہ دماغ ابھی شور و شر سے خالی ہے

یہی نہیں ہے کہ ہم کو نہیں پتا کچھ بھی
اُدھر وہ بابِ خبر بھی خبر سے خالی ہے

تری زمیں پہ مری خاک بے ٹھکانہ ہے
ترا فلک مرے شمس و قمر سے خالی ہے

سو راہِ عمر میں اس کے سلوک پر یہ کھلا
مری دُعائے محبت اثر سے خالی ہے

ترے کرم سے ہمیں کیا، کہ اب ہمارے لیے
ترا خزینہ بھی لعل و گہر سے خالی ہے

تہی ہے خواب کی خوشبو سے باغِ شب تو اُدھر
ہماری صبح بھی رنگِ سحر سے خالی ہے

اگرچہ خاکِ وطن اُڑ رہی ہے چاروں طرف
مگر یہ چشم کہ خوابِ سفر سے خالی ہے

فساد سے نہیں رغبت مگر یہ یاد رہے
یہ دل وہی ہے جو ہر ایک سے ڈر سے خالی ہے

ملالِ عصر کی صورت گری کہاں ہوگی
ترا ہنر کدہ، اہلِ ہنر سے خالی ہے

○

وقفِ آلامِ دو جہاں ہی رہا
دل تیری راہ میں رواں ہی رہا

وہ دمکتی شبیہ سامنے تھی
چشمِ تر میں مگر دھواں ہی رہا

کم نگاہی تری کہ دل تیرا
بدگماں تھا سو بدگماں ہی رہا

سو چکی تھیں وہ مہرباں آنکھیں
دل میں پھر رنج رفتگاں ہی رہا

در بدر ہی گزار دی ہم نے
سر میں سودائے رائگاں ہی رہا

داستاں ختم ہو گئی آخر
اور میں زیبِ داستاں ہی رہا

قصدِ راہِ عدم؟ نہیں مرے یار
جو ادھر کو گیا، وہاں ہی رہا

جو بھی تیری امان میں آیا
وہ تہی دست، بے اماں ہی رہا

............

ہم اک خوابِ وحشت سے بیدار ہو کر
نکل آئے دُنیا میں تیار ہو کر

پھر اُس قیدِ عزلت میں سر مارتے ہیں
ہم آدابِ محفل سے بیزار ہو کر

اب آ گے کہیں راہِ غفلت ہے شاید
یہاں تک تو آئے تھے ہشیار ہو کر

ہُوا تو بھی بے مہر دُنیا میں شامل
بہت دکھ دیے تُو نے غم خوار ہو کر

سو اے عرصۂ ہجر و کنجِ تمنا
اُسے کھو دیا ہے نگہ دار ہو کر

ہم اس چشمۂ زندگی سے گئے ہیں
گہے تشنہ لب، گاہ سرشار ہو کر

ہر اک آنکھ میں اب کھٹکنے لگے ہیں
ہم اُس کم نُما کے طلب گار ہو کر

سو اب ہیں سبک دوشِ خوابِ محبت
رہِ بندگی میں سبکسار ہو کر

اے چشمِ کرم، اب جو ہو حکم، حاضر
ترے سامنے ہیں گنہ گار ہو کر

............

○

اور جینے کی اب ہے صورت کیا
کچھ نہ کام آئے گی محبت کیا

جانے دنیائے خواب سے
پیش آئے ہمیں مصیبت کیا

ہم فقیروں سے آملیں گے کہیں
خاک ہوں گے نہ اہلِ حشمت کیا

دیکھ رکھے ہیں ہم نے دیوانے
ہم بھلا کیا، ہماری وحشت کیا

جو بھی ہم کو ملا، ملا ہی نہیں
زندگی بھی ہے راہِ فرقت کیا

بس فنا قائم و سلامت ہے
کیا ہے افلاس اور امارت کیا

کچھ بھی کھلتا نہیں ہمارے بیچ
فتح مندی ہے کیا، ہزیمت کیا

چھوڑ یہ وضع داریاں اپنی
اس تکلف کی ہے ضرورت کیا

تجھ پہ کچھ بس نہیں رہا ہے مرا
جا مرے دوست اب اجازت کیا

عشق میں بار کوئی پا نہ سکا
سعیِ ناکام میں ہے عزت کیا

جو بھی کچھ ہے کہیں دھوکا ہی نہ ہو
قرب، فرقت کا اشارہ ہی نہ ہو

باہر آ کر کبھی دیکھو تو سہی
کوئی دہلیز پہ بیٹھا ہی نہ ہو

بے مروّت وہ نہیں ہے ایسا
شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو

کیا خبر گھر ہوں مگر شور نہ ہو
رنگ ہوں، رنگِ تماشا ہی نہ ہو

کچھ غرض اس میں نہ پنہاں ہو کہیں
تیرا غم بھی، غمِ دُنیا ہی نہ ہو

وصل یہ بھی نہ جدائی ہو کہیں
یہ جو اپنا ہے پرایا ہی نہ ہو

محوِ غفلت! نہ وہ دن آئے کبھی
جب ترا چاہنے والا ہی نہ ہو

در و دیوار چمک اُٹھے ہیں
یہ ترے رُخ کا اُجالا ہی نہ ہو

کیا خبر دل ہو مگر رنج نہ ہو
آنکھ ہو اس میں نظارہ ہی نہ ہو

خواب سے جس نے جگایا ہے ہمیں
وہ کہیں نیند کا جھونکا ہی نہ ہو

جو بھی کہنا ہے وہ کہتا جاؤں
شاید اب لوٹ کے آنا ہی نہ ہو

اور کیا رہ گیا ہے ہونے کو
ایک آنسو نہیں ہے رونے کو
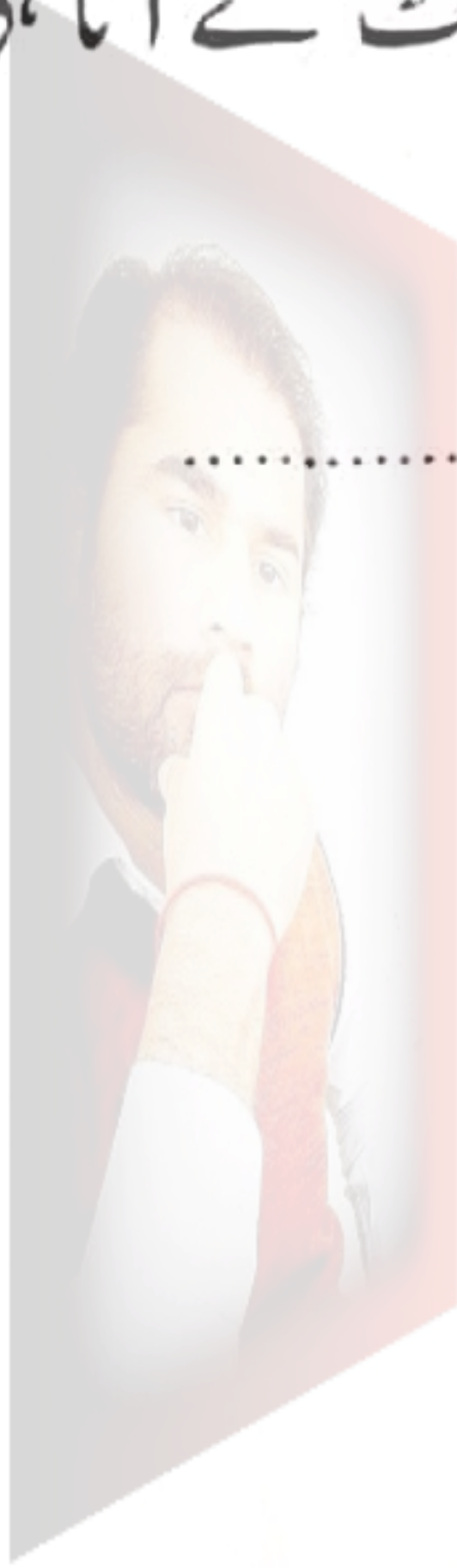
خواب اچھے رہیں گے ان دیکھے
خاک اچھی رہے گی سونے کو

تو کہیں بیٹھ اور حکم چلا
ہم جو ہیں تیرا بوجھ ڈھونے کو

چشمِ نم چار اشک اور ادھر
داغ اک رہ گیا ہے دھونے کو

بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی
کیا کریں اوڑھنے بچھونے کو

یہ مہ و سال چند باقی ہیں
اور کچھ بھی نہیں ہے کھونے کو

نارسائی کا رنج لائے ہیں
تیرے دل میں کہیں سمونے کو

آج کی رات جاگ لو یارو
وقت پھر حشر تک ہے سونے کو

یاد بھی تیری مٹ گئی دل سے
اور کیا رہ گیا ہے ہونے کو

............

کہیں پر صبح رکھتا ہوں، کہیں پر شام رکھتا ہوں
پھر اس بے ربط سے خاکے میں خود سے کام رکھتا ہوں

سلیقے سے مَیں اس کی گفتگو کا لطف لیتا ہوں
اور اس کے روبرو، دل میں خیالِ خام رکھتا ہوں

بظاہر مدح سے اس کی کبھی تھکتا نہیں لیکن
درونِ خانۂ دل، خواہشِ دشنام رکھتا ہوں

خوشی آئی ہے ابھی تو قیدِ خواہش اس خرابے میں
ابھی خود کو رہینِ گردشِ ایام رکھتا ہوں

سفر کی صبح میں رنجِ سفر کی دھول اڑتی ہے
حدِ آغاز میں اندیشۂ انجام رکھتا ہوں

فراق و وصل سے ہٹ کر کوئی رشتہ ہمارا ہے
کہ اس کو چھوڑ پاتا ہوں نہ اس کو تھام رکھتا ہوں

دلیلِ خوابِ مستی ہے تری آمادگی امشب
مگر اس شب میں تجھ سے اور کوئی کام رکھتا ہوں

تجاوز سے بھلا کب تک گزر اوقات ممکن تھی
سو اپنے خون تک شورِ دلِ بدنام رکھتا ہوں
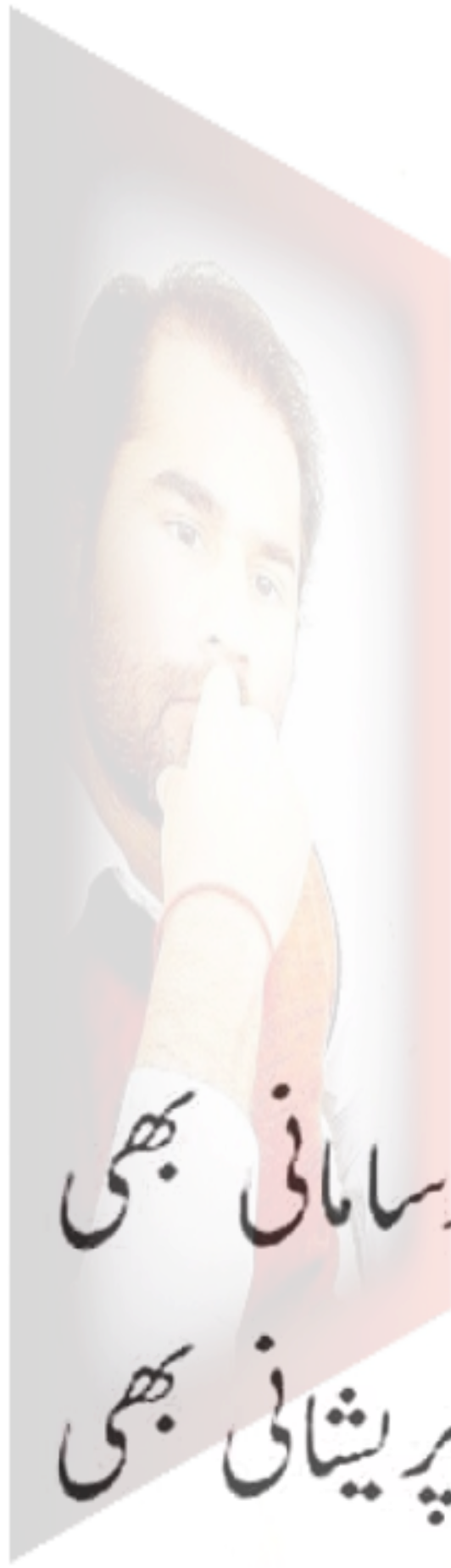
راہ دشوار بھی ہے، بے سروسامانی بھی
اور اس دل کو ہے کچھ اور پریشانی بھی

یہ جو منظر، ترے آگے سے سرکتا ہی نہیں
اس میں شامل ہے تری آنکھ کی حیرانی بھی

اپنے مجبور پہ کچھ اور کرم ہو کہ اُسے
کم پڑی جاتی ہے اب غم کی فراوانی بھی

صرف افسوس کا سایہ ہی نہیں ہے ہم پر
ہم کہ ہیں خوابِ تب وتاب کے زندانی بھی

بے نیازی کی وہ خو جیسے کبھی تھی ہی نہیں
خواب تھے جیسے وہ ایّامِ تن آسانی بھی

رہ تری چھوڑ کے کیوں جانبِ دُنیا آئے
ہم کو جینے نہیں دیتی یہ پشیمانی بھی

............



○

مجھے معلوم ہے اب کوئی نہیں ہے میرا
جہاں کوئی بھی نہیں، کوئی وہیں ہے میرا

کوئی سرشاری سی سرشاری ہے
نیند بھی عالمِ بیداری ہے

کام نمٹائے چلے جاتے ہو
کیا کہیں اور کی تیاری ہے



کوئے جاناں بھی ہمیں کھینچے ہے
اور یہ جاں بھی ہمیں پیاری ہے

ہم تجھے تجھ سے سوا مانگتے ہیں
یہ بھلا کیسی طلب گاری ہے

محوِ نظارہ ہے وہ آنکھ ابھی
سو تماشا بھی ابھی جاری ہے

جیتنا تجھ سے نہ چاہا ورنہ
ہم نے بازی کوئی کب ہاری ہے

ہوش مندی کا صِلہ ہے شاید
یہ جو دیوانگی اب طاری ہے

گرد سی سر سے نکلتی ہی نہیں
جانے کس شے کی فسوں کاری ہے

اب اسے کوئی خوشی یاد نہیں
دل ترے غم سے بھی انکاری ہے

خیر دُنیا سے تو بچ نکلے تھے
تو نے جو وار کیا' کاری ہے

ہم ہیں اور طاعتِ بے معنی ہے
وہ ہے اور اُس کی نگہ داری ہے

○

نشۂ قرب سے سرشار کرے گا اک روز
وہ مجھے خواب سے بیدار کرے گا اک روز

وہ جو آئے گا ہمیں رہ پہ لگانے کے لیے
راہ کچھ اور بھی دشوار کرے گا اک روز

اک وہ قصہ کہ نہیں جس سے ہمیں ربط کوئی
ہم کو رسوا، سرِ بازار کرے گا اک روز

ہم نہیں ہیں، یونہی منہ پھیر کے جانے والے
دیکھ تو ہم کو گنہ گار کرے گا اک روز

عکسِ منزل سے وہ بھر دے گا یہ آنکھیں میری
پھر مری راہ کو دیوار کرے گا اک روز

وسعتِ دل میں کہیں آگ سی جل اٹھے گی
چاند اس دشت کو پھر پار کرے گا، اک روز

خوابِ خوش رنگ، شب و روز کی بے کیفی میں
ہم کو پھر تیرا طلب گار کرے گا اک روز

کھو کے رہ جائے گا آنکھوں میں ہر اک رنگِ نشاط
دل ترے غم سے بھی انکار کرے گا اک روز

وہ خوشی ہے کہ رُلائے گی ہمیں آخرِ کار
وہم ایسا ہے جو بیمار کرے گا اِک روز

............

○

وہ دیکھیں گے ہم جو کبھی دیکھا نہیں ہوگا
آنکھیں اُسے ڈھونڈیں گی، تماشا نہیں ہوگا

اک خوابِ زیاں سے گھر بھر گئے سارے
اب کوئی یہاں نیند کا ماتا نہیں ہوگا

دل ہوگا، نہیں ہوگا، کسی یاد کا مسکن
سو بامِ طلب پر کوئی چہرہ نہیں ہوگا

ہم ہوں گے، نہیں ہوں گے، ترے شام وسحر میں
لیکن تجھے اس بات کا دھڑکا نہیں ہوگا

یہ سر کہ بھرا ہوگا فراوانیِ شب سے
پھر تا بہ اَبد دل میں اُجالا نہیں ہوگا

یہ خواب سا منظر ہے بس اک عمر کا مہماں
پھر حشر تلک اس کا نظارہ نہیں ہوگا

پھر کس لیے ہم زحمتِ اُمید اٹھائیں
اُس شہر میں جب کوئی بھی تجھ سا نہیں ہوگا

بھر جائیں گے اک روز سبھی گھاو ہمارے
اے دردِ محبت ترا چارہ نہیں ہوگا

بیٹھے بیٹھے جانے کہاں پر کھو جاتے ہیں
کبھی کبھی تو ہم دیوانے ہو جاتے ہیں

ہنس پڑتے ہیں کچھ اپنی بے حالی پر، پھر
رونا ہو تو اپنے حال پہ رو جاتے ہیں

کبھی اچانک اُمڈے چلے آتے ہیں آنسو
اور کچھ داغ جو اس دل پر ہیں، دھو جاتے ہیں

اور تو ہم کو کیا لینا دینا ہے کسی سے
جاتے ہوئے کوئی یاد دلوں میں سمو جاتے ہیں

جانے کہاں سے ظاہر ہو جاتے ہیں انساں
اور خدا معلوم کدھر کو کھو جاتے ہیں

اوروں کا سامان تو خیر اُٹھتا بھی کہاں ہے
بوجھ مگر اپنے حصّے کا ڈھو جاتے ہیں

بن برسے گزرے ہی چلے جاتے ہیں بادل
کچھ کچھ پھر بھی ہر آنگن کو بھگو جاتے ہیں

آگ تھا تو اور راکھ ہوا جاتا ہے آخر
تیرے لیے ہنستے بھی رہے اب رو جاتے ہیں

لڑتے رہتے ہیں آنکھوں کے عقب میں کسی سے
اور تھک ہار کے آخر ہم بھی سو جاتے ہیں

یاد آتے ہیں دوست کبھی پھولوں کی طرح سے
کانٹا سا کوئی تارِ نفس میں پرو جاتے ہیں

یہ دیوانگی سہی نہیں جاتی ہے تم سے
کہتے ہو تو اور کسی کے ہو جاتے ہیں
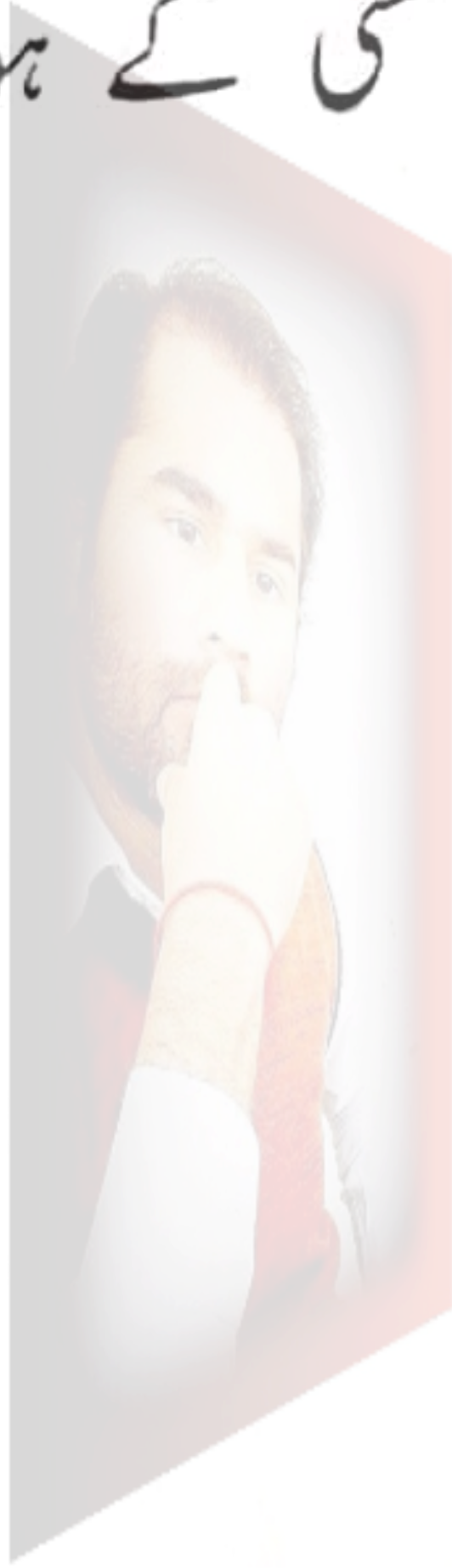
تم جس جگہ نہ ہو وہیں دیکھا کریں گے ہم
اب اپنے خواب کو نہیں رسوا کریں گے ہم

یہ سوچ کر خراب کیے جا رہے ہیں کام
جو کام بھی کریں گے وہ اچھا کریں گے ہم

اُس شہرِ گم شدہ میں جو تم ساتھ لے چلو
ہر طاق میں چراغ جلایا کریں گے ہم

آ بھی گیا تو آرزوئے وصل اب کسے
اب اور انتظار بھی کتنا کریں گے ہم

اک بارِ نارسائی نے جینے نہیں دیا
کیا اور اب کسی کی تمنا کریں گے ہم

یوں ساتھ چھوڑتے تو نہیں ہیں مگر چلو
تم چاہتے یہی ہو تو ایسا کریں گے ہم

ہر وصل پیشِ خیمۂ رنجِ فراق ہے
تُو ساتھ ہوگا اور تجھے ڈھونڈا کریں گے ہم

سرمستیِ جنوں سے تو بچنا محال ہے
تم دیکھنا کہ پھر سے تماشا کریں گے ہم

آخر یہ داغِ دل ہے، چمکنا تو ہے اسے
ایسا بھی اب نہیں ہے کہ چرچا کریں گے ہم

سر تا قدم سوال ہیں، اب اور کیا کریں
مت جان تجھ سے کوئی تقاضا کریں گے ہم

اب اور خاک ہونے کی ہمت نہیں مگر
جو عہد کر چکے ہیں، وہ پورا کریں گے ہم
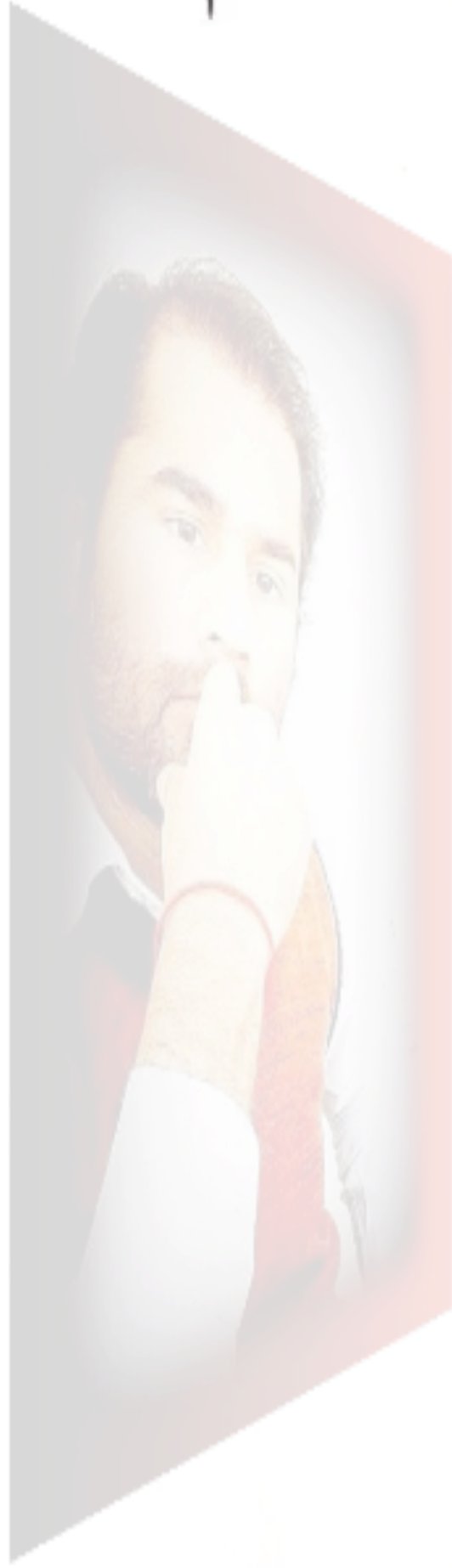
○

آنکھ جو آج کہیں ٹھیک سے رُکتی بھی نہیں
کیا خبر کل وہ تری دید کے قابل ہو جائے
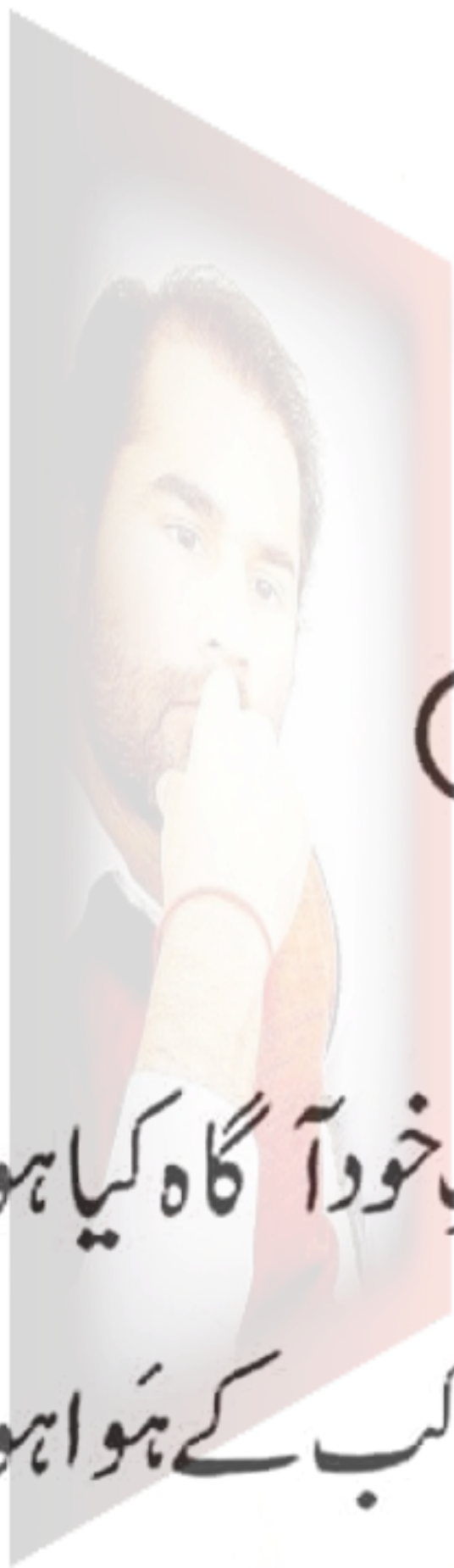
اب کیا کہیں وہ خوابِ خود آ گاہ کیا ہوئے
وہ رت جگے وہ سال تو کب کے ہَوا ہوئے

اڑتے پھرے ہیں مثلِ غبارِ مہِ تمام
اترے تری گلی میں، تری خاکِ پا ہوئے

ہاں تیری جستجو بھی کریں گے، مگر یہاں
عمرِ گریز پا سے جو لمحے جدا ہوئے

دل سے گزر رہی تھی ہوائے خبر، سو ہم
بن کر درِ خیال، تری سمت وا ہوئے

بے مائیگی یہی تری طاقت رہی کہ ہم
دُنیائے عز و جاہ میں عبرت کی جا ہوئے
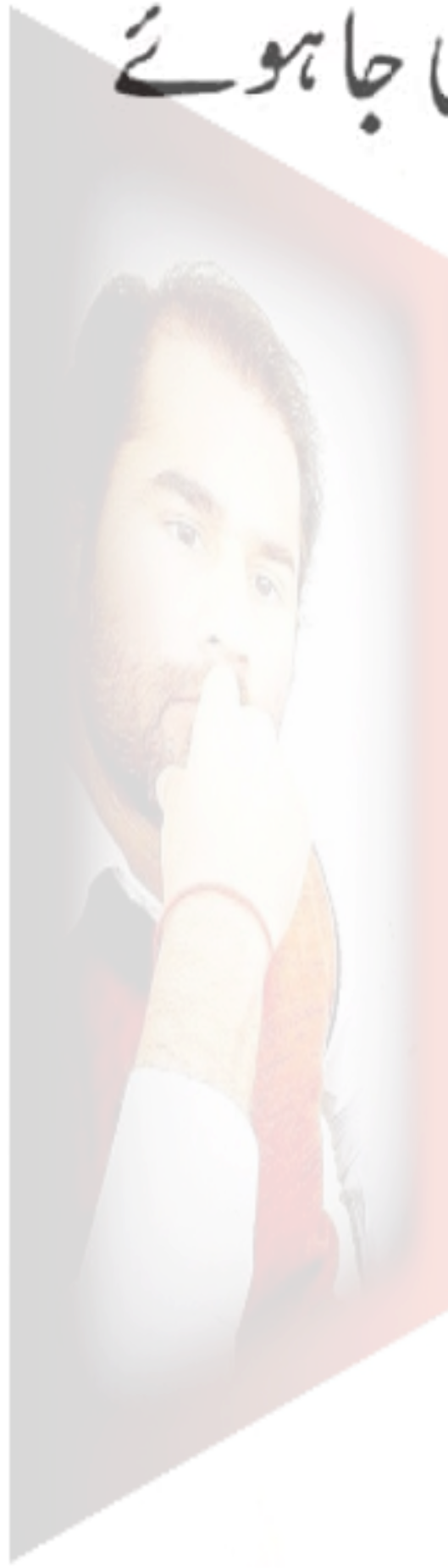
○

ایک تصویر کا ملبہ ہے پڑا
اور کمرے میں ہَوا ہے باقی

ہماری دسترس میں کیا نہیں ہے
مگر کوئی ترے جیسا نہیں ہے
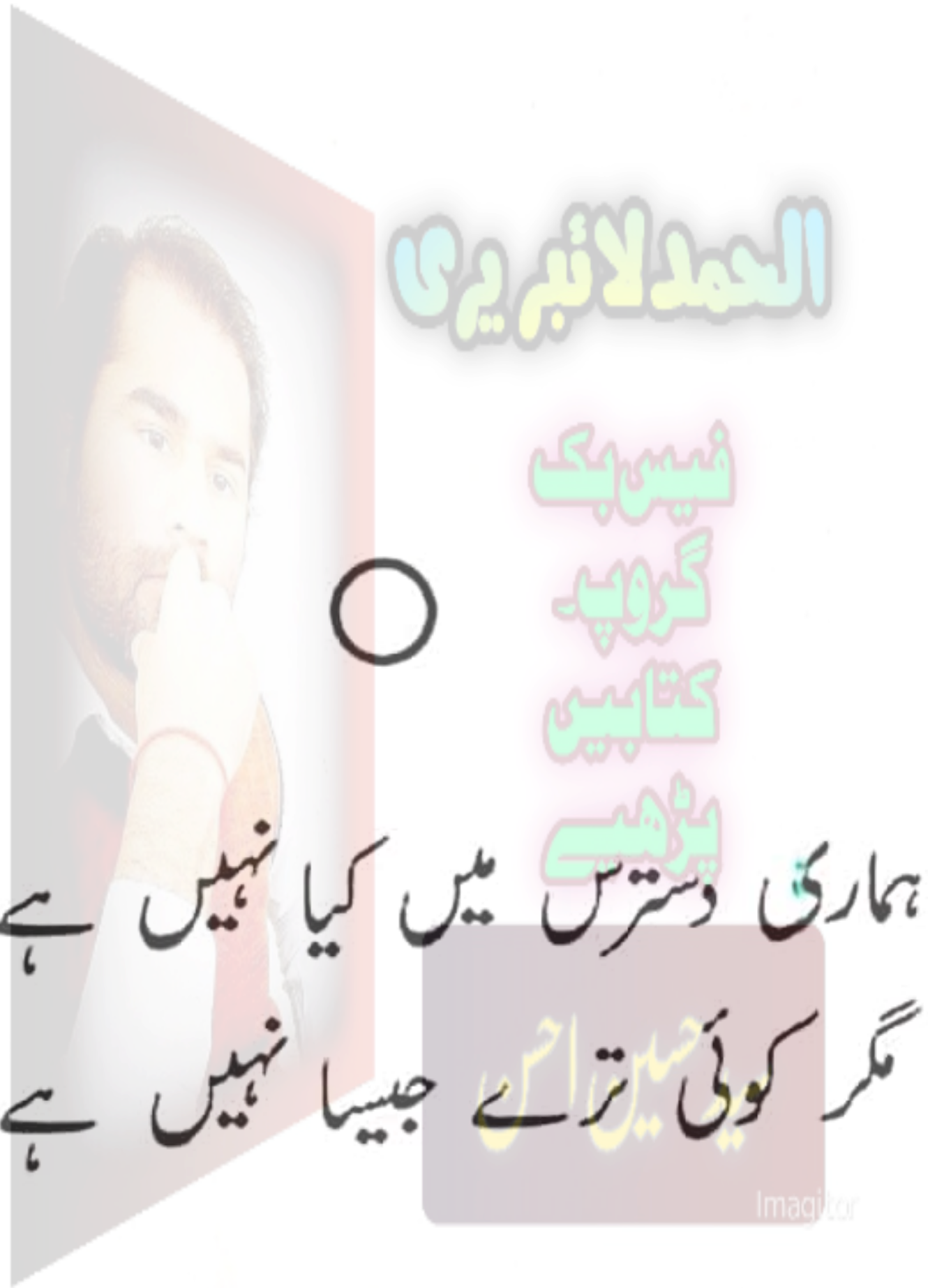
وہ کیا خوابِ محبت تھا کہ ہم نے
پھر اس کے بعد کچھ دیکھا نہیں ہے

ابھی اُس ابر سے آنکھیں ہیں خالی
ابھی اُس یاد نے گھیرا نہیں ہے

نہیں اوڑھی ردائے سرخوشی بھی
لباسِ درد بھی پہنا نہیں ہے

یہ مٹّی ہے تو اُڑتی کیوں نہیں ہے
یہ دریا ہے تو کیوں بہتا نہیں ہے

یہ بستی ہے تو کیوں جاگی نہیں ہے
یہ جنگل ہے تو کیوں مہکا نہیں ہے

کبھی میں جا نکلتا ہوں اُدھر بھی
سو وہ رشتہ ابھی ٹوٹا نہیں ہے

یہ رخنہ وقت نے ڈالا ہے اب کے
ہمارے درمیاں دُنیا نہیں ہے

تو کیا یہ شہر ہے شہرِ خموشاں؟
یہاں میری کوئی سنتا نہیں ہے
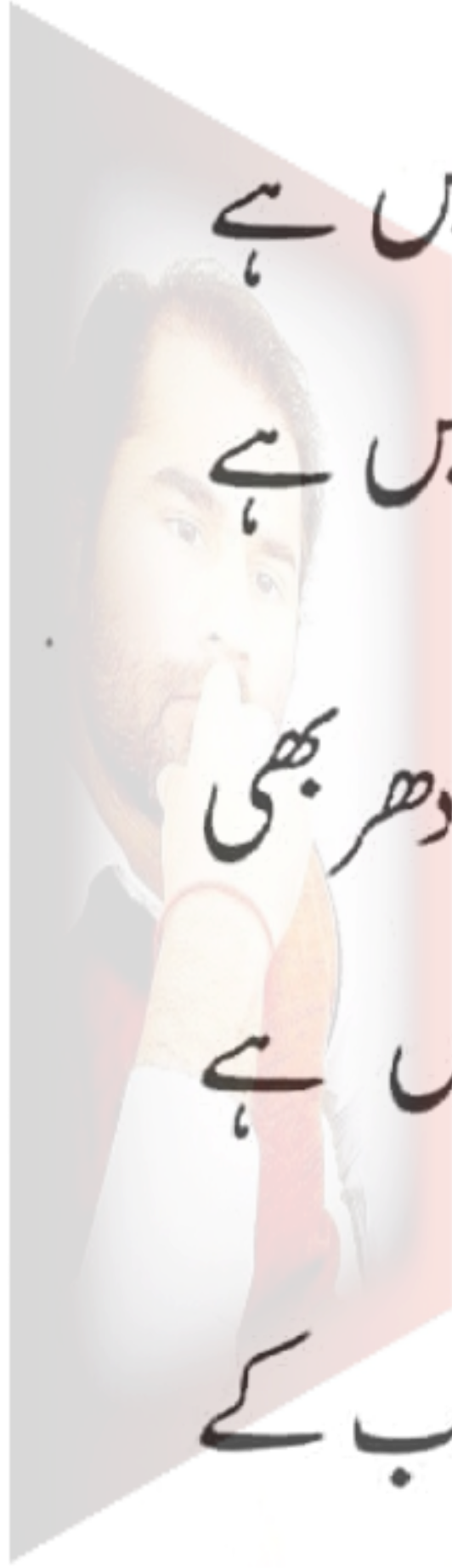
جو حالت تھی بتا دی صاف ہم نے
ہمارا آپ سے پردہ نہیں ہے

کوئی دن یاد آئے گی ہماری
ابھی اس خاک کو اُڑنا نہیں ہے

جو تھی روزِ ازل سے مجھ پہ طاری
فسوں اُس نیند کا ٹوٹا نہیں ہے

............



سید حسین احسن

○

وہ نہ ہوگا بام پر، ہُوں دربدر کس کے لیے
جب سفر میں کچھ نہیں، قصدِ سفر کس کے لیے

جب حدِ امکاں میں ہی اڑنا بھی ہے، چلنا بھی ہے
پاؤں پھر کس کے لیے ہیں، بال و پر کس کے لیے

ہم بکھرنے کے لیے ہیں، تم پہنچنے کے لیے
منزلیں کس کے لیے ہیں، رہگزر کس کے لیے

بابِ غفلت کس نے کھولا، لوٹ کر آیا ہے کون
رائیگاں ہیں منتظر، وہ بام و در کس کے لیے

کس کے لب پیاسے ہیں تیری بارشوں کے، میرے دل
اب بھری رہتی ہے تُو اے چشمِ تر کس کے لیے

جب تری دیوار ہی ہم کو میسر اب نہیں
پھر لیے پھرتے ہیں یہ سودائے سر کس کے لیے

میں تو ذرہ ہوں، فنا کی دھول میں کھو جاؤں گا
جب نہیں میرے لیے تو بحر و بر کس کے لیے

جانے والے بھول جاتے ہیں، کسے چھوڑ آئے ہیں
خاک چھانیں کیا، رہیں ہم نوحہ گر کس کے لیے

جب ہمیں ہی ساتھ لے کر چل نہیں سکتی کہیں
پھر بھلا یہ گردشِ شام و سحر کس کے لیے
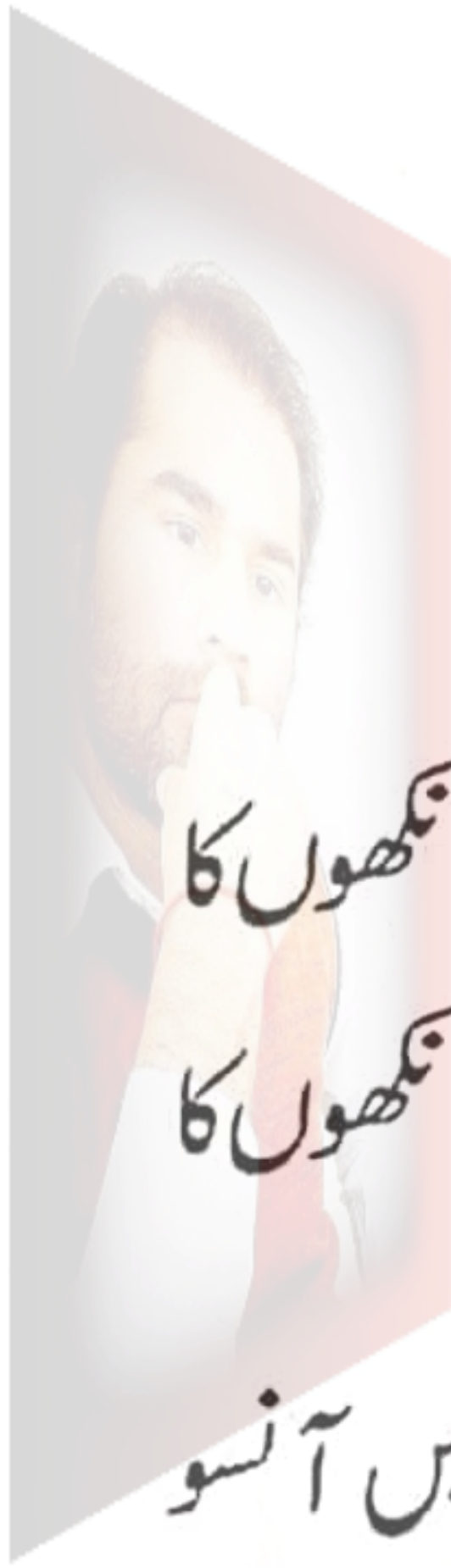
سید حسین احسن

خواب سے ٹوٹ نہ جائے یہ بھرم آنکھوں کا
نیند کے دشت میں پہلا ہے قدم آنکھوں کا

دل کشادہ نہیں اتنے کہ سنبھالیں آنسو
آ کے پلکوں پہ ٹھہر جاتا ہے نم آنکھوں کا

ہر رفاقت کو کہاں خوابِ مسلسل ہے نصیب
ٹوٹ جاتا ہے کبھی ربطِ بہم آنکھوں کا

اِک مسلسل رُخِ بیمار ہے تا حدِ نظر
ہم سے دیکھا نہیں جاتا ہے یہ غم آنکھوں کا

طبعِ ناخوش کے لیے رنگ اُٹھا لاتی ہیں
دلِ بے مایہ پہ ہے یہ بھی کرم آنکھوں کا

اک ابد خواب کی خوشبو میں بسا رہتا ہے
دھند میں سویا ہوا باغِ عدم آنکھوں کا
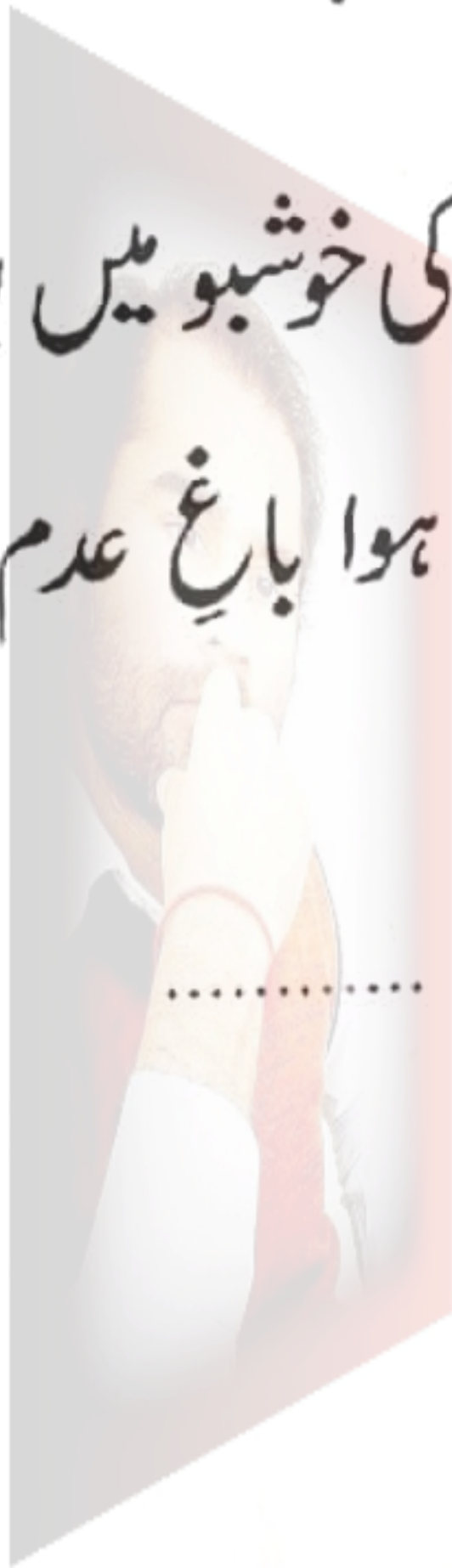


..............
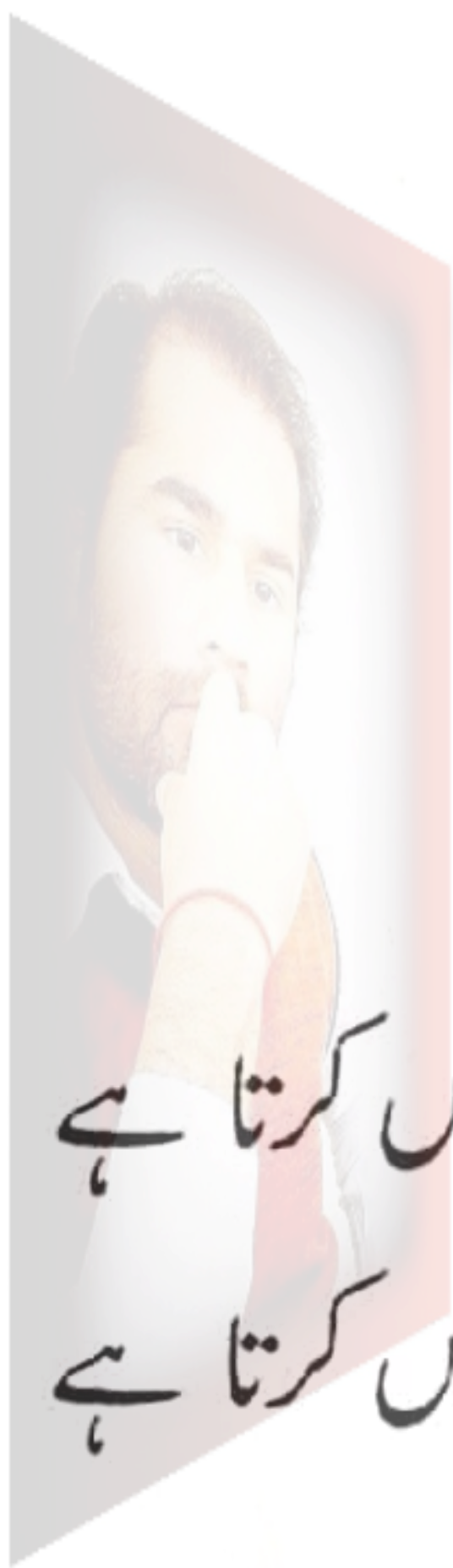
اس سے ملنے کا اشارا ہی نہیں کرتا ہے
خوابِ ہستی ہمیں بھایا ہی نہیں کرتا ہے

مل تو لیتا ہے وہ ہر روز، مگر میرے لیے
اہتمامِ شبِ وعدہ ہی نہیں کرتا ہے

ہر گھڑی ساتھ لگا رہتا ہے سائے کی طرح
دھیان اس کا کہیں تنہا ہی نہیں کرتا ہے

کیا علاج اس کا کہ مائل بہ طلب دل تیرا
تنگ دستی کو گوارا ہی نہیں کرتا ہے

تو ہے کس زعم میں اے خواب فراموش مرے
دل تو اب کوئی تقاضا ہی نہیں کرتا ہے

کچھ اندھیرے بھی بچھا جاتا ہے ہر آنگن میں
چاند ہر گھر میں اُجالا ہی نہیں کرتا ہے

ہو سکیں ہم بھی بہم ماضی و فردا سے کہیں
غمِ موجود کنارہ ہی نہیں کرتا ہے



............

یہ قربت فاصلہ ہونے کو ہے پھر
کہ منزل راستہ ہونے کو ہے پھر

غبارِ خواب چھٹتا جا رہا ہے
ہمیں اپنا پتا ہونے کو ہے پھر

نہ جانے کون کس کے کام آئے
نہ جانے کیا سے کیا ہونے کو ہے پھر

یہ دل جس چشم سے ڈرتا بہت ہے
اسی کا سامنا ہونے کو ہے پھر

ابھی پہلی مصیبت کم نہیں تھی
درِ آفات وا ہونے کو ہے پھر

چلو جرمِ طلب ہم نے کیا ہے
چلو ہم کو سزا ہونے کو ہے پھر؟

جسے یہ آنکھ پھر سے دیکھتی ہے
وہی اک سانحہ ہونے کو ہے پھر

○

جستجو، خوابِ جستجو ہی نہ ہو
دھیان میں پھر وہ خوبرو ہی نہ ہو

ختم ہونے میں آئے کام یہ اب
آرزو ہے کہ آرزو ہی نہ ہو

کہتا پھرتا ہوں ساری دنیا سے
بات جو تیرے روبرو ہی نہ ہو

کیوں نہ پھر تشنہ لب کریں وحشت
جب کہیں گردشِ سبو ہی نہ ہو

جو نہ آتش نصیب ہو، نہیں دل
گل ہے کیا جس میں رنگ و بو ہی نہ ہو

تو جو چاہے تو استوار ہوں میں
میں بھلا کیا، کہیں جو تو ہی نہ ہو

زمزمہ کیا جو زیرِ لب ہی رہے
وہ صدا کیا، جو چار سو ہی نہ ہو



○



تھکن سے چور' شکستِ شبِ وصال کے بعد
خموش بیٹھا ہوں اِک عمر کے زوال کے بعد
پھر اس کے بعد کہا زندگی نے' چپ رہنا!
کوئی سوال نہ تھا' اوّلیں سوال کے بعد

○

دیارِ کبر و ریا میں کمال میں نے کیا
کہ اعتبارِ رہِ دل بحال میں نے کیا



وہ خوش ہوا کہ مرے زخم بھر گئے آخر
یہ ایک میں کہ غمِ اندمال میں نے کیا

ترے لیے دلِ بے داغ کیسے لاتا میں
گریز تجھ سے سوائے خوش خصال، میں نے کیا

وہ جوش و وحشت و بیگانگی کا عالم تھا
خجل بہت ہوں کہ اس کا یہ حال میں نے کیا

کسے نصیب ہے آخر دوامِ مہلتِ دید
شبیہ و خوابِ ازل سے سوال میں نے کیا

وہ شامِ شامِ الم تھی' سو اپنی آنکھوں میں
چراغِ خواب جلائے' ملال میں نے کیا

.............

○
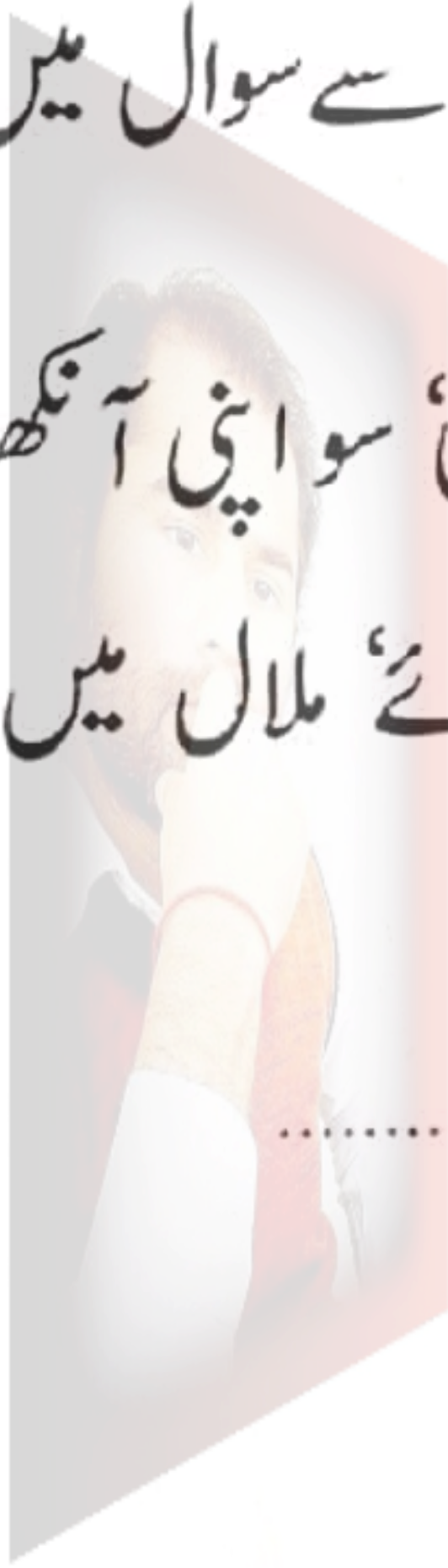


ہم پہ کچھ دل کا حال کھولو نا



کیا تمھیں ہو گیا ہے بولو نا



کیوں کھڑے دیکھتے ہو مُنہ سب کا

تم بھی دُنیا کے ساتھ ہولو نا

ایسے گم سم ہو جیسے زندہ نہیں

کچھ تو دیکھو کہیں تو بولو نا

ہنس بھی لیں گے کہ وقت آئے گا

دل گرفتہ بہت ہو رو لو نا

جاگ لینا، میں سو گیا جس دم
میں ابھی جاگتا ہوں، سو لو نا

ٹیس بِن یہ سفر نہیں کٹتا
خار کوئی، کہیں چبھو لو نا

تم کو مل جائیں گے جواب سبھی
اپنے دل کو کبھی ٹٹولو نا

مہرباں ہے وہ مثلِ ابرِ کرم
اپنی خفّت کا داغ دھولو نا

غم جو آنکھوں میں لے کے پھرتے ہو
اس کو لفظوں میں اب سمو لو نا

پھر تو سب خاک ہو ہی جائے گا
خوابِ ہستی میں آنکھ کھولو نا!

............

ایسا بھی نہیں ہے کہ ضرورت نہیں بابا
ہاں جاں پہ وہ پہلی سی مصیبت نہیں بابا

ہم آگ کو سینے سے نکلنے نہیں دیتے
جو تجھ کو پہنچتی ہے وہ حِدّت نہیں بابا

یہ ہم جو ذرا بُجھ سے گئے ہیں، سبب اس کا
پژمردگیِ دل ہے، ہزیمت نہیں بابا

مائل بھی اگر ہوں تو نہیں کہتے کسی سے
اب عرضِ تمنا میں وہ لذت نہیں بابا

ہم تیری طرف یوں ہی چلے آتے ہیں ہر روز
کیوں جان کو آتا ہے، محبت نہیں بابا

اب جی تو لگانا ہے کسی رنگ بھی ہم نے
اس شخص میں کچھ تیری شباہت نہیں بابا

پہنچے تو ترے در پہ، جو آگے ہوا، اُس پر
افسوس تو بے شک ہے، ندامت نہیں بابا

جب دل کا نہیں دھیان، تو رکھ پاس مروّت
جو تُو ہمیں دیتا ہے، وہ عزت نہیں بابا

ہر شام ہُوا کرتی ہے کب شامِ غریباں
ہر روز یہاں روزِ قیامت نہیں بابا

اب جبرِ مشیت سے یہاں کس کو مفر ہے
زندہ ہیں تو یہ تیری عنایت نہیں بابا

کچھ خاک تو ہم ساتھ بھی لے جائیں گے ہر طور
ہر چیز یہاں تیری امانت نہیں بابا

○

پھول تو اب بھی صحنِ چمن میں کھلتے ہیں
لیکن ہم خوشبو کا ٹھکانا بھول گئے
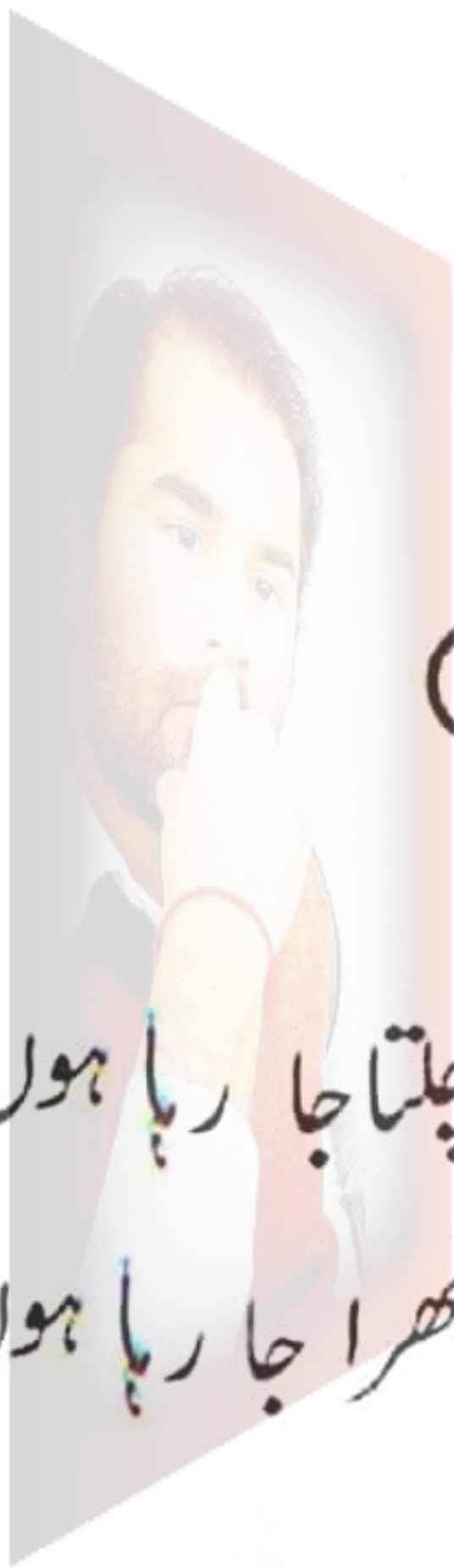
میں چلنے کو تو چلتا جا رہا ہوں
مگر یوں ہے کہ بکھرا جا رہا ہوں

چھپا بیٹھا ہوں اپنے آپ میں اور
کئی جانب سے دیکھا جا رہا ہوں

ہے رودادِ فریبِ آرزو بس
میں جس قصے سے بہلا جا رہا ہوں

دیارِ خواب سے نکلا ہوں جب کا
تو گھر کی سمت دوڑا جا رہا ہوں

کہیں پر ہو رہوں گا سنگِ منزل
ابھی تو گرتا پڑتا جا رہا ہوں

کوئی نخلِ محبت بھی کہیں ہو
رہِ دنیا میں جھلسا جا رہا ہوں



حدِ امروز سے گھبرا کے آخر
سرِ کوئے گزشتہ جا رہا ہوں



تلاطم کہہ رہا ہے مجھ سے، اب میں
کناروں سے نکلتا جا رہا ہوں

کبھی اُن کا غرورِ خواب بھی تھا
میں جن نظروں سے گزرا جا رہا ہوں
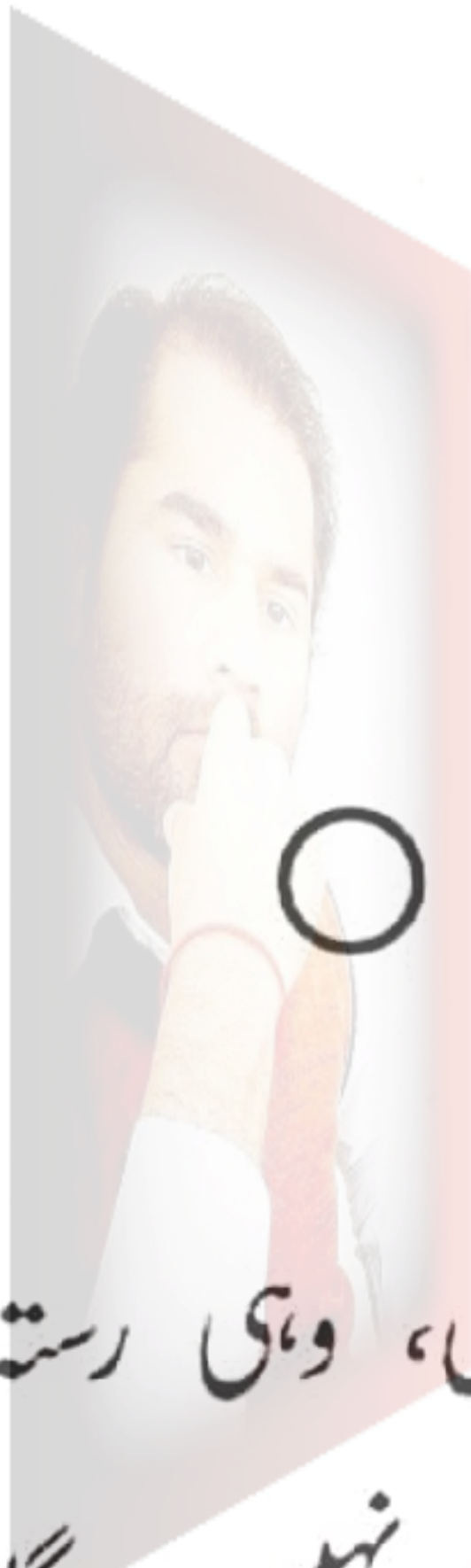
وہی ہم ہیں، وہی رستہ ہمارا
سفر کیا طے نہیں ہوگا ہمارا

محبت اور خوشی کی رہ گزر پر
گلِ ہستی اگر کھلتا ہمارا

بکھر کر رہ گئی ہے بزمِ یاراں

وہ کشتی کس کنارے جا لگی ہے
بلاتا ہے جسے دریا ہمارا

کوئی صورت نہیں سیرابیوں کی
ہے بادل سے بڑا صحرا ہمارا



تعلق ٹوٹ ہی جانے تھے آخر
مگر تجھ سے جو تھا رشتہ ہمارا



نہیں کہتے کوئی گر پوچھ لیتا
کسی نے حال کب پوچھا ہمارا

تو پھر کچھ کھینچ بھی اس دل کو پڑتی
اگر رستہ کوئی تکتا ہمارا

تو پھر بے دام بھی دل دل سے ملتے
اگر سِکہ کہیں چلتا ہمارا

اب اس کی نیند ہی بکھری پڑی ہے
کسی نے خواب کیا دیکھا ہمارا

ان آنکھوں میں وہ پہلی سی چمک ہے
پرانا ہو گیا چہرہ ہمارا

بہت وقفِ غمِ دُنیا ہوئے ہیں
بھلا بیٹھے ہیں، غم کیا تھا ہمارا

دلوں سے چاندنی بہنے لگی ہے
پڑا ہے جس جگہ سایہ ہمارا

صدا تو کر چلے ان بستیوں میں
چلو خالی سہی کاسہ ہمارا

جہاں کوئی شناسا بھی نہیں ہے
وہاں ہوگا کبھی چرچا ہمارا

............

کیا جانیے کیا ہے حدِ ادراک سے آگے
بس خاک ہے اس تیری مری خاک سے آگے

ہے شورِ فغاں، خامشیِ مرگ کے پیچھے
اک تیز ہوا ہے خس و خاشاک سے آگے

ہم دیکھتے ہیں آنکھ میں سہمے ہوئے آنسو
اک چپ ہے کہیں خندۂ بے باک سے آگے

اک رنگ سا ہے، رنگِ تمنا سے مماثل
اک ابر سا ہے دیدۂ نم ناک سے آگے

میں اپنے کسی خواب کی منہ زور ہوا میں
اکثر ہی نکل جاتا ہوں افلاک سے آگے

کیا شور کریں گریۂ عُشّاق سے بڑھ کر
کیا زور کریں پیرہنِ چاک سے آگے
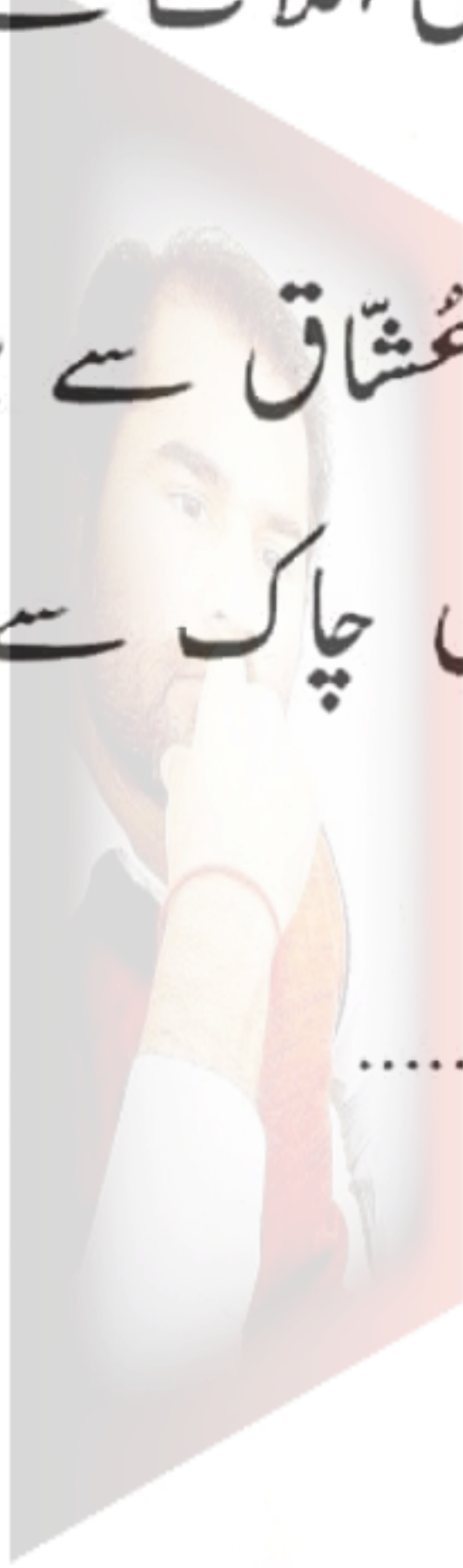
............

عزت نہیں رہی، کوئی ذِلت نہیں رہی
اب یاں کسی کی بھی کوئی وقعت نہیں رہی

وہ خواب ہے کہ رات میں جس کا نہیں سراغ
وہ نیند ہے کہ سونے کی عادت نہیں رہی

منظر وہ ہے کہ آنکھ جھپکتا نہیں کوئی
حیرت وہ ہے کہ سر پہ قیامت نہیں رہی

آسائشوں میں ڈوب گئی فرصتِ نظر
رُخ پر دوامِ ہجر کی رنگت نہیں رہی

اب کیا دروغ گوئی کرے گا کوئی یہاں
جب معتبر کوئی بھی روایت نہیں رہی

ہم بے نیازِ شام و سحر کیا ہوئے کہ پھر
درکار کوئی مُدّت و مہلت نہیں رہی

ہم دستِ التفات کو چھونے سے بھی گئے
سو یہ کھلا کہ اس کی ضرورت نہیں رہی

پھر بابِ ہجر و وصل کو کیا کھولتے پھریں
جب قصدِ کوئے یار کی ہمت نہیں رہی

ہاں اے چراغِ یاد! لہو سرد پڑ گیا
ہاں دوستو کہ دل میں وہ طاقت نہیں رہی

وہ رنج ہے کہ آنکھ میں آنسو بھی اب نہیں
وہ دکھ ہوا کہ دل میں عداوت نہیں رہی

بے مائیگی کی خیر، ہمیں کچھ خبر نہیں
کس کس کی تیرے شہر میں عزت نہیں رہی

○

مرحلے رنج کے سر کرتا ہوں
جانبِ مرگ سفر کرتا ہوں

پہلے الزام اٹھاتا ہوں کوئی
پھر زمانے کو خبر کرتا ہوں

کام جو سب نے کیے ہیں ان کو
میں بہ اندازِ دگر کرتا ہوں

عمر کچھ خواب میں بیتی، اور کچھ

لوٹ جاتا ہوں محبت کی طرف
جب بھی دُنیا پہ نظر کرتا ہوں

رو کے رکتی نہیں جب یورشِ غم
تیری چاہت کو سپر کرتا ہوں

پہلے دیوار گراتا ہوں کوئی
پھر اُسے راہگذر کرتا ہوں

سہما رہتا ہوں بہت اندر سے
بات بے خوف و خطر کرتا ہوں

جی مچلتا ہے فراغت کے لیے
کام کوئی بھی اگر کرتا ہوں

ایک جاں کاہ تعلق لے کر
تیری دُنیا سے گزر کرتا ہوں

○

مُند گئی ہیں آنکھیں بھی، ختم ہے تماشا بھی
خواب ہو گیا ہم کو اب تمھارا قصّہ بھی

ایک نام میرا بھی، جو نظر نہیں آتا
تو بہت اکیلا بھی، تیرے ساتھ دُنیا بھی

کس لیے تماشا ہے، ہم اگر نہیں موجود
کون دیکھ پائے گا، کیا کسی نے دیکھا بھی

رُت بدل تو جائے گی، آنکھ بھر تو آئے گی
نشۂ رفاقت میں، دل کو ہے یہ دھڑکا بھی

ایک سا تلاطم ہے، دل سے ساحلِ جاں تک
آنکھ کو نہیں ہوتا، اب تو کوئی دھوکا بھی

تو نے جس طرح چاہا، مجھ کو نقش پہنائے
کیا عجب بگڑ جائے، اب جو تیرا چہرہ بھی!

ہم بھی بھول جائیں گے، عرصۂ محبت کو
ہاں ہمیں بھلا دے گی، ایک دن یہ دُنیا بھی
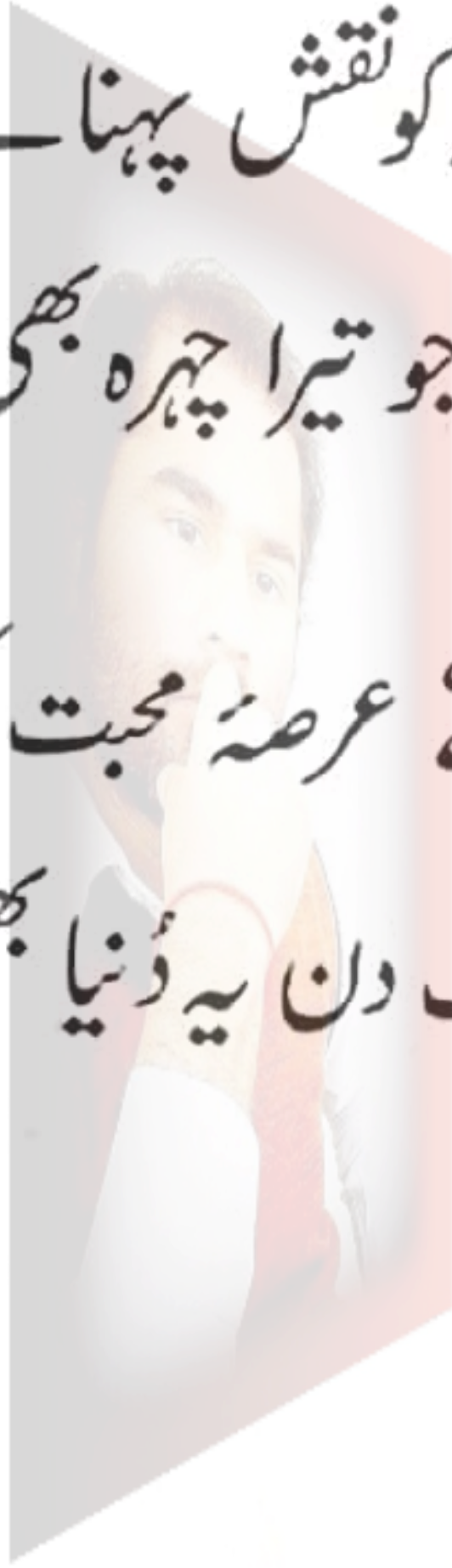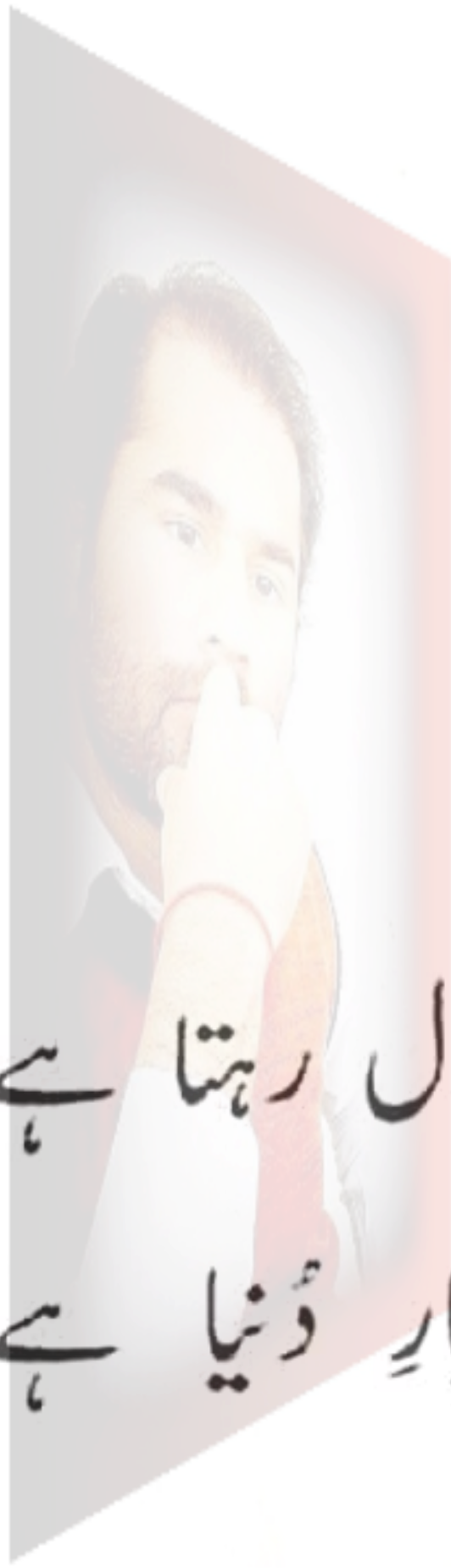
دل میں اب یہ ملال رہتا ہے

ہم ہیں اور کاروبارِ دُنیا ہے

بے طلب بھی جیا نہیں جاتا

آرزو سے بھی دم نکلتا ہے

بے خبر ہو، تمھیں پتا ہی نہیں

ہاں مگر، میں نے اس کو دیکھا ہے

وصل تو خیر وصل ہے پھر بھی
دل ترے ہجر کو ترستا ہے

دھیان میں کس کے ہے وہ چشمِ کرم
یہ دریچہ کدھر کو کھلتا ہے

آنکھ ہے جس میں اشک رہتے ہیں
دل ہے جس میں تری تمنا ہے

دیکھ میں ہر گھڑی ہوں پاس تِرے
روز مجھ سے کوئی یہ کہتا ہے

کون آیا ہمارے بعد یہاں
کون اب اس گلی میں رُسوا ہے

کس کے ماتم کا اب ہے شور یہاں
اب یہاں کون ہاتھ ملتا ہے

جب تو مرا ہم سبو نہیں ہے
مَیں مَیں نہیں، تو بھی تو نہیں ہے



یہ گل ہیں مگر مہک سے خالی
یہ رنگِ نمو نمو نہیں ہے



دیکھا ہے مآلِ آرزو بھی
اب کوئی بھی آرزو نہیں ہے

یہ آئینہ ہے اور ہی کہیں کا
دُنیا مرے روبرو نہیں ہے

کیا تیری مثال مل سکے جب
مجھ جیسا بھی ہُو بہُو نہیں ہے

سر میں ہے فسادِ دشت گردی
ویسے کوئی جستجو نہیں ہے

یہ اور ہی ڈھنگ کی ہیں باتیں
تجھ سے تو یہ گفتگو نہیں ہے

سید حسین احسن
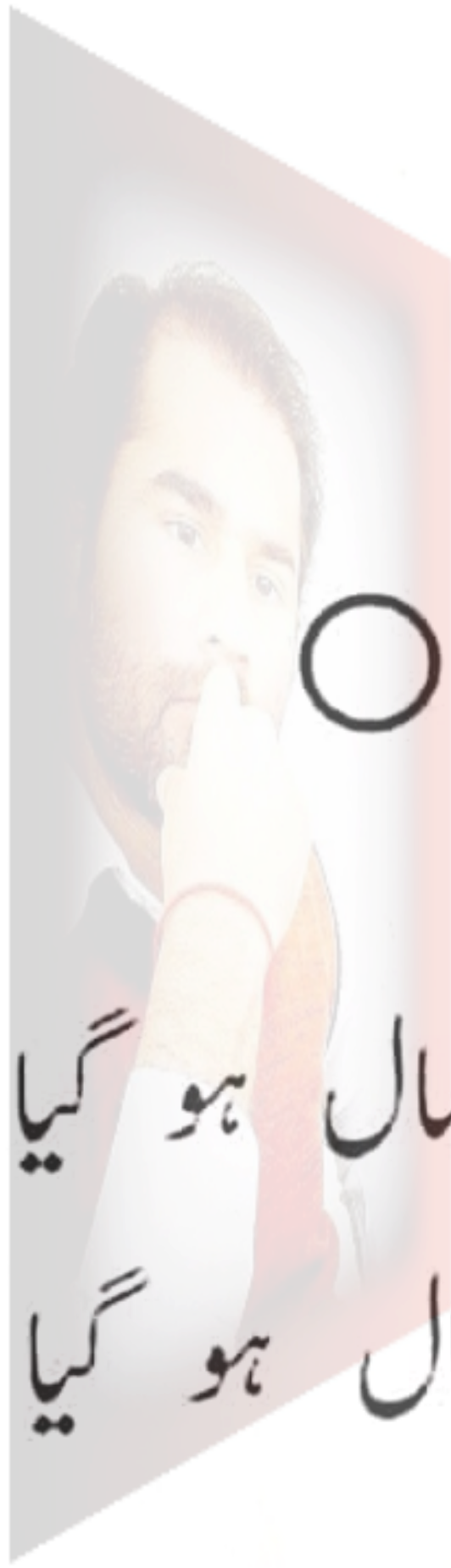
یہ بھی تو کمال ہو گیا ہے
ظاہر وہ جمال ہو گیا ہے

جس کام میں ہم نے ہاتھ ڈالا
وہ کام محال ہو گیا ہے

گزری ہوئی عمر کا ہر اک پل
مِنّت کشِ حال ہوگیا ہے

دل کون سا تازہ دم تھا پہلے
اب اور نڈھال ہو گیا ہے

کچھ روز جو دن پھرے ہیں اپنے
وہ شاملِ حال ہو گیا ہے

جو خواب ہے، خون سے کمایا
وہ مفت کا مال ہو گیا ہے

یہ دیکھ، کہ تیرے سامنے کون
سرتاپا سوال ہو گیا ہے

اے خوفِ زوال تیرے ہاتھوں
سب رُو بہ زوال ہو گیا ہے

............

○

بوند جو دل میں گری وہ اور ہے
آسماں پر ابر پارہ اور ہے

آتشِ کبر و ریا کچھ کم نہ تھی
تیری تلخی کا شرارہ اور ہے

وقت قیدِ روز و شب سے ماورا
جو لیے جاتا ہے دھارا اور ہے

............

اور اب کہتا ہوں بے خوفی سے ڈر جاتا
میں شام اتر آنے سے پہلے گھر جاتا



کچھ بھی تو نہیں جو بھول نہیں جاتا مجھ کو
تو آنکھوں تک آیا، دل میں بھی اتر جاتا



اک وہ بھی جس نے رنج سوا ہمیں کچھ نہ دیا
کوئی اور جو ہوتا، کاسۂ عمر کو بھر جاتا

اک چپ جس نے تہمت نہ اٹھانے دی ہم کو
ہم بول اٹھتے تو زعمِ عرضِ ہنر جاتا

اب لوٹ آنا بھی کچھ بے کار سا لگتا تھا
ہم جاتے، ساتھ ہمارے رنجِ سفر جاتا

کبھی ڈھنگ سے رخصت بھی تو نہ کر پائے تجھ کو
تو رک نہیں سکتا تھا تو یہ دل ہی ٹھہر جاتا



○
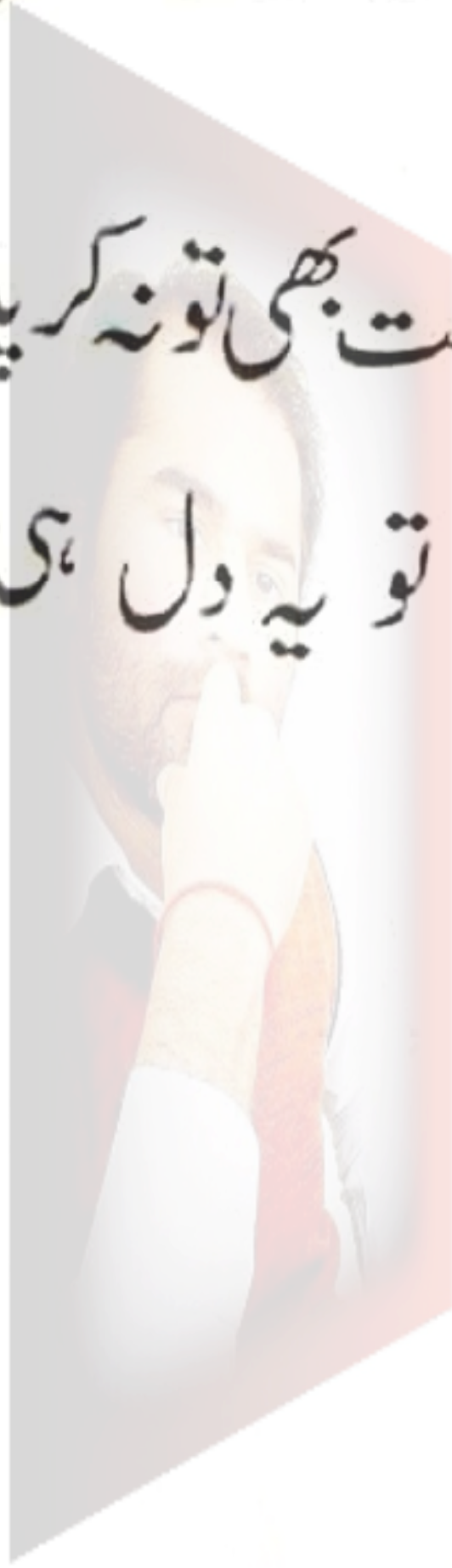
اب وصل کی خواہش تو رَوا ہے مرے خوش رُو
ہم حد سے زیادہ کی تمنا نہیں کرتے
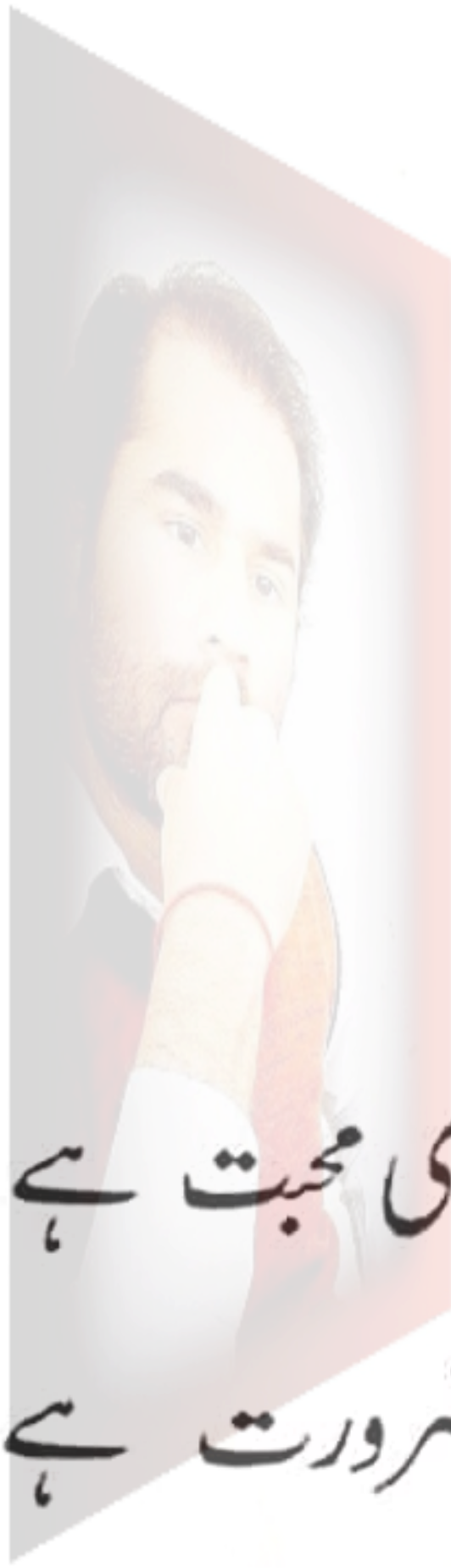
تو ہے، دل میں تری محبت ہے
اور کس چیز کی ضرورت ہے

ہم تہی دست ہیں سراپا طلب
اور ہر شے کی ایک قیمت ہے

تم جہاں ہم سے مل رہے ہو وہاں
دور تک عرصۂ قیامت ہے

تم جہاں پھول چننے آئے ہو
خوشبوؤں کی وہاں سے ہجرت ہے

کم نظر ہم نہ تھے، مگر یوں ہے
یہ جو دنیا ہے، اس میں رغبت ہے



ہم نہیں تیرے بندگاں میں تو کیا
تیرے قبضے میں ایک خلقت ہے



یہ اسیری نہیں، رہائی نہیں
یہ تو کچھ اور ہی مصیبت ہے



دل نہیں، دل میں اب وہ غم بھی نہیں
اور اس پر ہمیں ندامت ہے

کھول دے آنکھ، دیکھ لے تو بھی
جو تری نیند میں کرامت ہے

مہلتِ یک نفس دوبارہ نہیں
دیکھ یہ سلسلہ ہمیشہ نہیں

رونقیں سب ہمارے دم سے ہیں
ہم نہیں ہیں تو پھر تماشا نہیں

تب ترے بن نہ جی سکے تھے ہم
اب ترا دھیان بھی گوارا نہیں

ایک دُنیا کہ جانتی تھی ہمیں
ہاں مگر تو نے ہم کو جانا نہیں

ہم تماشا تھے، ہم تماشائی
دیکھنے والے، تو نے دیکھا نہیں!



چلے جاتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں
اس زمیں سا کوئی ٹھکانا نہیں



رسمِ افسوس اُٹھ گئی شاید
اب کے کوئی بھی دل گرفتہ نہیں

حیف اے بحرِ خود فراموشی
اب کہیں یاد کا جزیرہ نہیں

دو گھڑی ہنس کے بات کر ہم سے
زندگی کا کوئی بھروسا نہیں

○

تواتر سے یہ فرصت ہے میسّر
ابھی دل کو محبت ہے میسّر

تمھیں جو بھی میسر ہو، ہمیں کیا
ہمارے گھر کو راحت ہے میسّر

ترے دم سے سرافرازی ملی تھی
ترے ہاتھوں ہزیمت ہے میسّر

کہاں تک عرصۂ محشر رہے گا
کہاں تک یہ قیامت ہے میسّر

میسّر ہے دلِ بے خواب ہم کو
کہ جب تک خوابِ غفلت ہے میسّر

ابھی یہ شور تھمنے کا نہیں ہے
ابھی سانسوں کی تہمت ہے میسّر

اذیّت ہے میسّر اس کا ہونا
یہ ہونے کی جو ذلّت ہے میسّر

ترے زیرِ نگیں تب تک رہیں گے
کہ جب تک استطاعت ہے میسّر

ردائے خاک میں یا خواب میں ہیں
ہمیں کیسی محبت ہے میسّر!

............

دل کبھی میرے بس میں تھا کہ جو ہے
یہ پرندہ قفس میں تھا، کہ جو ہے

عمر بھر جس نے بات مانی ہے
وہ مری دسترس میں تھا کہ جو ہے



ایسے چپ ہو گئے کہ سوچتے ہیں
شور تارِ نفس میں تھا کہ جو ہے

جو اشارہ غبارِ راہ میں تھا
وہ صدائے جرس میں تھا کہ جو ہے

حال جو اس برس ہوا، اُس کا
دھیان پچھلے برس میں تھا کہ جو ہے

جو مزہ عشق میں ملا ہم کو
وہ ہوا و ہوس میں تھا کہ جو ہے

وہ مرا خوابِ رفتہ و موجود
وقت کے خار و خس میں تھا کہ جو ہے

آخرِ کار ہار مان گئے
فائدہ پیش و پس میں تھا کہ جو ہے

راستے دشوار ہوتے جا رہے ہیں
حوصلے بیمار ہوتے جا رہے ہیں

وہ جو میری راہ میں بچھتے رہے تھے
اب وہی دیوار ہوتے جا رہے ہیں

آنکھ بھر کر ہم انہیں تکتے نہیں تھے
جو ہمیں درکار ہوتے جا رہے ہیں

ایک تجھ سے ہی یہ اکتاہٹ نہیں ہے
خود سے بھی بے زار ہوتے جا رہے ہیں

جن میں ہنستے کھیلتے گزرا تھا ہر پل
گھر وہ اب مسمار ہوتے جا رہے ہیں

پاؤں دلدل میں اترتے جا رہے ہیں
ہم زمیں پر بار ہوتے جا رہے ہیں

جانی انجانی منازل کے لیے پھر
قافلے تیار ہوتے جا رہے ہیں

خاک اُڑنے لگی ہے اب، شاید

نقشِ معلوم کا، رہے نہ رہے

اک نگاہِ کرم اِدھر بھی کہ پھر

یہ وفا، یہ جفا رہے نہ رہے

نیک و بد ایک ہوں، خدا معلوم

کچھ برا، کچھ بھلا رہے نہ رہے

ہاتھ جیسے ہے کوئی شانے پر

اور یہ آسرا رہے نہ رہے

............

کیا خبر ابتدا بھی ہو معدوم
کیا خبر انتہا رہے نہ رہے

بزمِ یاراں میں دن گزار کوئی
جانے یہ سلسلہ رہے نہ رہے

کس کو معلوم استوار ہو کیا
کون جانے کہ کیا رہے نہ رہے

آ نکلتے ہیں سیرِ دُنیا کو
پھر یہ موجِ ہوا رہے نہ رہے

سو ہی جائیں گے ہم بھی بالآخر
تو بھی پھر جاگتا رہے نہ رہے

کام لے کچھ نہ جانے دل میرا
پھر کسی کام کا رہے نہ رہے

بھر لائے ہیں ہم آنکھ میں رکھنے کو مقابل
اک خوابِ تمنّا، تری غفلت کے برابر

# آخری دن سے پہلے

ابرار احمد
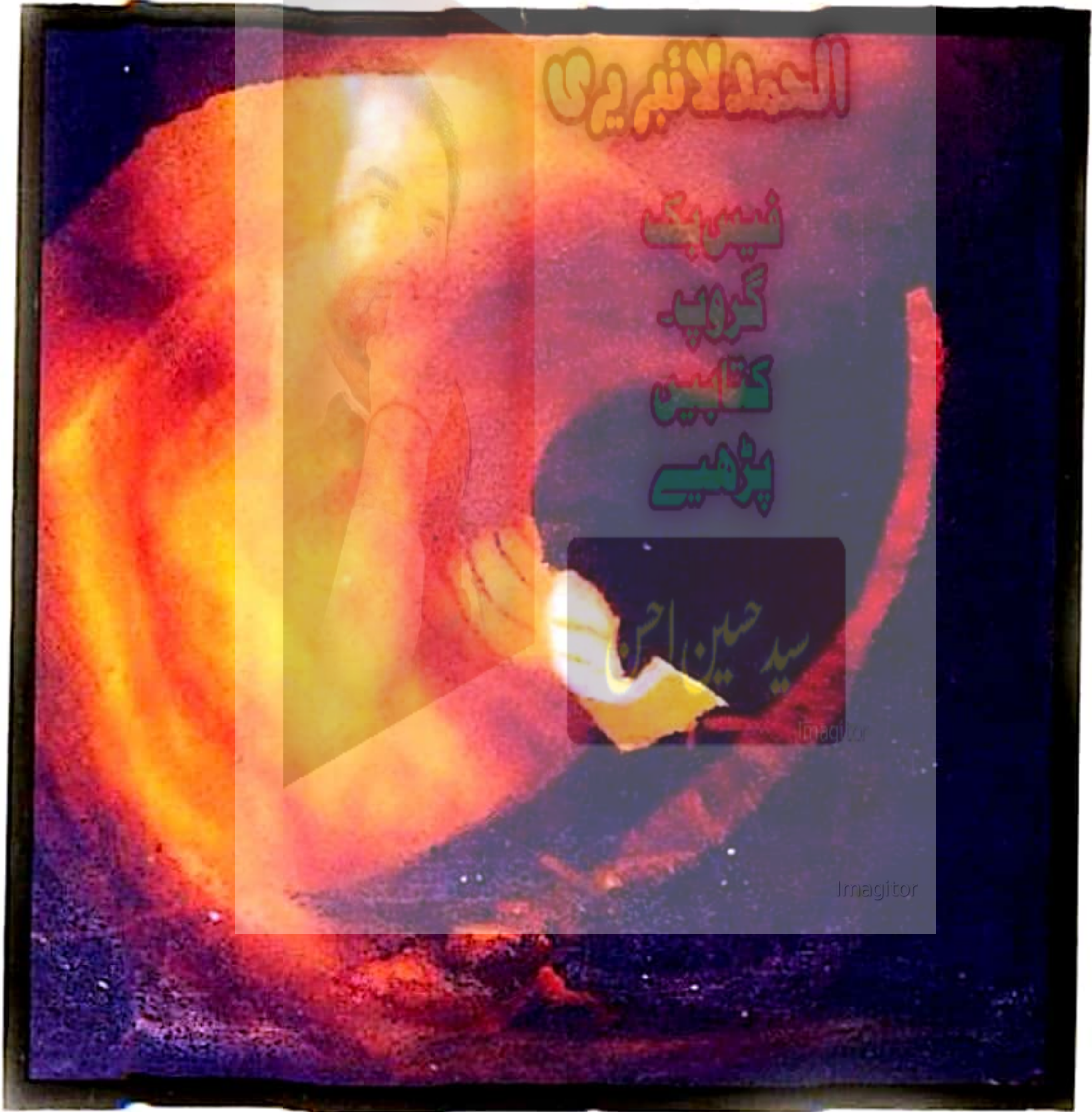


GORA PUBLISHERS
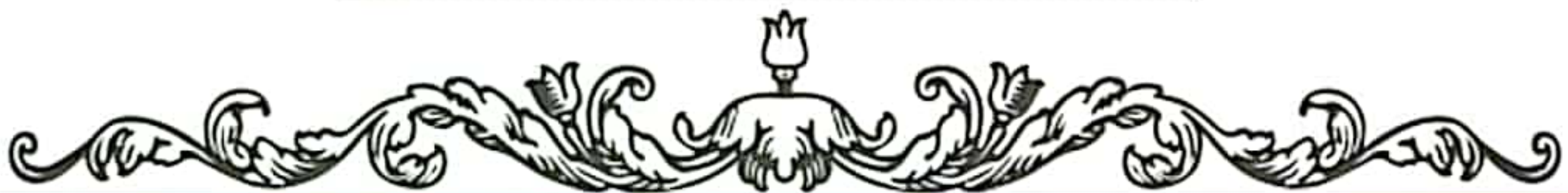
ہر نئی آواز اس لیے نئی نہیں ہوتی کہ اس میں شامل لفظ نئے ہوتے ہیں یا لہجہ نیا ہوتا ہے یا گفتگو کا انداز قدرے نامانوس ہوتا ہے۔ نیا پن ایک عجیب شے ہے جس سے دل میں سُرور اور جس کے ساتھ تعارف سے خوشی پیدا ہوتی ہے۔ اِن حوالوں سے آواز کے نئے ہونے کو پہچانا جا سکتا ہے

میں نے ابرار احمد کی نظموں میں ان کے عہد اور انکی نسل کا نیا پن پایا ہے اور آواز کی ایک ایسی مہک محسوس کی ہے جو پہلے سننے میں نہیں آئی اور لفظوں کے اندر جو شاعری مخفی ہے وہ بھی بہت کم لکھنے والوں کے حصے میں آئی ہے۔

نئی آواز کا نیا ہونا۔ ایک نئی تازگی کے سبب بھی ممکن ہوتا ہے اور تازگی کے بغیر کوئی شاعر اپنے آپ کو نیا شاعر یا ایک نئی آواز کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتا۔ ابرار احمد کی نظموں میں انسانی سرشت ایک نیا زائچہ تحریر کرتی ہے جسے اُردو شاعری کے مستقبل کے لیے ایک نیک فال گردانا جا سکتا ہے۔

شعری کائنات کی تشکیل کے لیے تو حسن انگیز نگاہ، صدا اور آواز، دل کی دبی دبی چاپ، ابرار احمد نے اپنی نظموں میں دریافت کی ہے وہ ہمارے عہد کے قلب و نظر کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے جس کی تقلید و تعریف سے اُردو شاعری کا ایک نیا باب تحریر کیا جا سکتا ہے۔

---

جیلانی کامران

لاہور
۹ فروری ۱۹۹۷ء

اُردو میں موضوعاتی نظم کی روایت نظیرؔ سے شروع ہوتی ہے۔ نظیرؔ کے بعد تقریباً ایک سو سال کا دور ایک ایسا تجرباتی دور ہے جس میں اس روایت سے ہٹ کر نئی راہیں دریافت کرنے کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ راشدؔ، میراجیؔ اور انکے عہد کے دیگر شعرا اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ انھوں نے نہ صرف اُردو نظم میں ہیئتی اور موضوعاتی سطح پر تجربے کیے بلکہ انھیں اپنے اور اپنے پیشرووں کے تجربات کی فصل کاٹنے کا بھی موقع ملا۔ تجربے کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن خوش بختی صرف انکے حصے میں آتی ہے جو تجربوں کے انبار سے مستقل ہیئتیں دریافت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ راشدؔ کے عہد کے شعرا کی خوش بختی کا سبب اُس عہد میں مشرق و مغرب کی شاعری کا ایک "کُل" (WHOLE) کی تلاش کا تجربہ بنتا ہے۔ ایسا تجربہ جو محض تجربہ نہیں رہا بلکہ آنے والے دور کے لیے ایک مستقل ہیئت کی شکل اختیار کر گیا اور موجودہ نظم کی جو عمارت ہمیں آج دکھائی دیتی ہے اسکی بنیادیں انھیں شعراء کی اُٹھائی ہوئی ہیں۔ بعد میں آنے والے شعرا نے نظم میں تجربات کے انبار لگا دیے۔ صنعتی دور میں انسانی معاشرے پر مشین کی گرفت نے جس انسانی مزاج کو جنم دیا، ان شعرا نے اپنی نظم میں اُس انسانی مزاج کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ان تجربات میں ساٹھ کی دہائی کی نئی نظم کی تحریک اور اس کے متوازی دوسرے شعرا کی انفرادی کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔ تجربے کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن ان شعرا نے "روحِ عصر" سے اُردو نظم کا دامن بھرنے کی کوشش میں مشرقی روایت سے اس کی جڑیں کاٹنے کی بھرپور سعی بھی کی۔

نظم گو شعرا کی موجودہ نسل، جس کا کام گزشتہ دو دہائیوں پر محیط ہے، اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ اس کے سامنے گزشتہ نسلوں کی کامرانیاں اور ناکامیاں دونوں موجود ہیں، اور اس نسل میں سے چند شعرا اس اعتبار سے مزید خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے گزشتہ نسلوں کے تجربات کی فصل کاٹنے کا کامیاب تجربہ بھی کیا ہے۔ جو کمال "تاریخی جبر" نے انھیں عطا کیا ہے وہ اس کمال کے علاوہ ہے جو یہ شعرا اپنی "ذات" کی سطح پر بھی رکھتے ہیں اور اس کا سبب نظم کے دامن میں استقلال پذیر ہیئتوں کی مسلسل دریافتوں کا وہ عمل ہے جو ان شعرا کے ہاں موجود نظر آتا ہے۔ ان شعرا نے مختلف شعری روایتوں سے اپنا ناتا توڑنے کی بجائے اُس "کل" (WHOLE) میں شامل ہونے کی سعی کی ہے جس میں مشرق کی شعری روایت کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر کی کاسموپولیٹن شعری روایات بھی شامل ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں کمالات نئی نسل کے جن معدودے چند شعرا کے ہاں یکجا نظر آتے ہیں ان میں ایک نام ابرار احمد کا بھی ہے اور یہ بات شاید کچھ ایسی غلط بھی نہیں کہ موجودہ نظم کے ہیئتی اور موضوعی تعیّن کے لیے اس شاعر کی نظم ایک معیّن سانچے یا پیٹرن کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔

محمد خالد

لاہور
۱۵، جون ۱۹۹۷ء

گورا پبلشرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۲۵- لوئر مال - لاہور

۱۹۹۷ء

بار : اوّل

سرورق : تحسین

اہتمام : افتخار احمد

قیمت : ۱۵۰ روپے

زاہد بشیر پرنٹرز ۔ لاہور

# قدیم قصبے کے نام

ہم لوٹیں گے تیری جانب
اور دیکھیں گے تیری بوڑھی اینٹوں کو

••••••••••••••••••••••••

ہم۔ آئیں گے
تیرے مضافات میں
مٹی ہونے کے لیے

الحمد لائبریری
آخری دن سے پہلے
کتابیں
پڑھیے

# پیش لفظ

ہمارے ادب کو جدیدیت اور عصری حسیت جیسے الفاظ کے بے دریغ استعمال نے بھی بڑا نقصان پہنچایا ہے——— شہرتِ عام اور بقائے دوام کے یہ دو ذرائع اب فارمولے کا درجہ رکھتے ہیں——— روزمرہ کے ہنگامی موضوعات کو شعر و ادب میں جوں کا توں رکھ دینا عصری حسیت اور کسی صنف میں تکنیکی یا لسانی سطح پر گمراہیوں کو رواج دینا جدیدیت کہلاتا ہے———

یہ آپا دھاپی کا زمانہ ہے ادب تعلقات عامہ کا ذریعہ ہے اور ایک ایسے زمانے میں جب کہ قاری کی صورت مشکل سے دکھائی دیتی ہے ادیبوں کی بھیڑ میں روز افزوں اضافہ کیا حیران کن نہیں؟ حالیہ برسوں میں کتنے ہی نو آموز شاعر صاحب دیوان ہوئے——— بلکہ کئی ایک تو صاحب کلیات بھی ہو گئے——— یہ کیا ہوا؟ شعر و ادب سے سنجیدگی کیوں رخصت ہو گئی——— اور اب کھوٹے کھرے کی شناخت کی کیا صورت ہو گی؟

میرے لئے یہ فکر مندی یوں پیدا ہوئی کہ ستر کی دہائی کے اواخر میں نظم سے اپنا رشتہ قائم کرنے والا شاعر ابرار احمد کہیں اب آ کے مجموعہ مرتب کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔ حالانکہ اس دوران اس کی شاعری نے نہ صرف یہ کہ اپنی شناخت مستحکم کی بلکہ اس کے بعض ہم عصروں نے اس کے اثرات بھی قبول کیے۔ عجلت پسند شاعروں کے درمیان اپنی دھن میں مگن رہنے کے اسباب کا اندازہ تو اس کی نظموں کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے مگر یہ طے ہے کہ کسی صنف سے کمٹمنٹ ایک سطح پر سہج سہج چننے اور سنبھل سنبھل کر کاتنے کا بھی

تقاضہ کرتی ہے۔

تمام تر ادب کی تو جو صورت حال ہے سو ہے نظم کا معاملہ تو اور بھی دگرگوں ہے ـــــ نظم کے ساتھ ایک مشکل یہ ہے کہ اس کی روایت بنانے والوں نے اس کے مزاج کو قدرے تفکر پسند بنایا ہے جسے سہل پسندی قطعاً راس نہیں ـــــ لیکن اردگرد دیکھئے تو آپ کو ایسے شاعر تو کم ہی ملیں گے کہ جنہوں نے جستجو کرنے اور کھوج لگانے کا روگ پالا ہو مگر دو چار اچھی لائنوں پر داد پانے کی فکر کو ترجیح دینے کا رجحان اک بھیڑ کو لاحق دکھائی دے گا ـــــ

یہ بات تسلیم کی جانی چاہیئے کہ ہر صنف ادب اپنی بھی ایک روایت رکھتی ہے اور ایسے بہت کم ہوتے ہیں جو اس صنف کا مزاج بھی سمجھتے ہوں اور اس کی روایت کا شعور بھی رکھتے ہوں۔ نظم کے نئے تصورات راشد، میرا جی اور فیض سے جب آغاز ہوئے تھے تو شاعری میں ایک نئی طرح کی فکرمندی داخل ہوئی تھی ادب ذمہ داری کا کام تھا۔ نظم کی ہیئت میں فکری اعتبار سے جو روایت جگہ پانے لگی تھی اس کا تعلق انسان کی تخلیقی شخصیت سے تھا جسے مادی ارتقاء متاثر کرتا تھا۔ یہ اسی مزاج کی دین تھی کہ آگے ساٹھ کی دہائی میں نظم نے ایک نئی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ یوں ایک ایسی صنف کا سراغ ملا جو انسان کو اپنا محور بناتی تھی اور اس کے مقام کا تعین کرتی تھی۔

اس کے بعد زمانے نے کچھ ایسا رخ بدلا کہ شہرت کی چاٹ اور عجلت پسندی کے باعث تمام تر ادب سے بالعموم اور نظم سے بالخصوص سنجیدگی رخصت ہونے لگی ـــــ نظم سے بالخصوص اس لئے کہ اس کے نظریہ سازوں نے بعض متنازعہ مباحث کھڑے کر کے اس کی تخلیقی اپج کے راستے میں مشکلات بھی پیدا کیں اس سے خرابی یہ ہوئی کہ جب ستر کی دہائی کا آغاز ہوا اور نئے سیاسی سماجی اور نفسیاتی تموجات پیدا ہوئے تو انسان کے مسائل میں کچھ اور طرح کا بھی اضافہ ہوا۔ خارجی ماحول میں مقامی اور ہنگامی نوعیت کے مسائل کی اہمیت بڑھ گئی۔ شعر و ادب کے لئے اس سے دامن بچانا مشکل ہوا۔ یہ ایک نیا شعری

امکان تھا سو ہم نے دیکھا کہ اپنے مسائل سے حقیقی تعلق پیدا کرنے کے لئے ستر کی دہائی میں لسانی تشکیلات کا فارمولا تو قطعاً" ناکافی ثابت ہوا——— نئے عصر میں انسان کی ذات کا روحانی سطح پر متاثر ہونا اور پھر اس سوال کا جنم لینا کہ خود اس کی موجودگی کیا معانی رکھتی ہے نئی نظم کی تحریک میں اساسی نظریئے کے طور پر آئے تھے مگر اب نئے حالات میں اس صنف کو نئی صورت حال کا سامنا تھا لیکن ہوا یہ کہ بیشتر جگالی کرتے رہ گئے یا پھر خارجی حالات کے بیان میں مقبول فارمولوں کا سہارا لیا۔ ارتقاء کی صورت بہت کم دکھائی دی۔ نتیجتاً نئے آنے والوں میں ایسے تو بہت کم دکھائی دیئے جو روایت کو درست طرح سے شناخت کر سکیں اور پھر اسے نئے عہد سے ہم آہنگ بھی کریں——— اس بہت ہی مختصر فہرست میں ثروت حسین' نسرین انجم بھٹی' افضال احمد سید' عذرا عباس' وغیرہم کے ناموں کو غنیمت جانا جا سکتا ہے جو اپنے اپنے اسلوب میں ہجوم سے الگ اپنا معیار قائم رکھتے ہیں——— اور مزید غنیمت ہے کہ ابرار احمد بھی کسی ایسی ہی اپنی راہ پر چل رہا ہے۔

ابرار احمد کا زمانہ وہی ہے جب گزشتہ شعری نظریات پر ایسے موضوعات غلبہ پانے لگے تھے جنہیں فوری توجہ درکار تھی۔ ملک پر مارشل لاء کی حکمرانی تھی جو مزاحمت پر اکساتی تھی لہٰذا جبر سے تصادم کا رویہ سب سے طاقتور حوالہ بن رہا تھا۔

ایک ایسے سماج میں جہاں استبداد کی مختلف النوع صورتیں انسان پر عرصہ حیات تنگ کر رہی ہوں وہاں موجود موضوعات کے پھیر میں عمومی انداز میں آ جانا بعید از قیاس نہیں ہونا چاہیئے۔ مقبول عام رویے اپنے اندر بڑی کشش رکھا کرتے ہیں مگر تاریخ کی رو کو تو اپنا سفر اپنے فطری انداز سے ہی جاری رکھنا ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے انسان پر تو ہر زمانہ ایک ہی طرح کے مسائل لے کر آیا ہے۔ ایک ہی طرح کے شب و روز اور زمانہ در زمانہ ایک ہی طرح کا مقسوم ——— انسان کی یہی لاحاصلی' بے مائیگی' ذلت اور ہزیمت ابرار احمد کے شعور

کا مزاج بناتی ہے لہٰذا وہ خارج کی محض اوپری سطح پر تبصرہ کر کے الگ ہونے کی بجائے روح عصر کو شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یوں ہجوم سے الگ ہو کر بھی سوچتا ہے یہی اس کی پہچان ہے۔

"ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے
جلو میں کوچے مکان لے کر
سفر کے بے انت پانیوں کی تھکان لے کر
جو آنکھ کے عجز سے پرے ہیں
انہی زمانوں کا گیان لے کر"



اور پھر یہ کہ ——

"اذیت روز و شب میں
ہونے کی ذلتوں میں نڈھال صبحوں کی
اوس میں بھیگتی، ٹھٹھرتی
خموشیوں کے بھنور کے اندر
دلوں سے باہر —— دلوں کے اندر
ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے"

(ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے)

ابرار احمد کی لفظیات میں ہوا کو یہ مرتبہ حاصل ہے کہ وہ تاریخ اور زمانے کے مترادف ہو جاتی ہے۔ ہم اس علامت کے توسط سے شہروں کے بسنے اور اجڑنے کا عمل بھی دیکھتے ہیں۔ دنوں کے نکلنے اور بکھر جانے کی کہانی بھی پڑھتے ہیں۔ گنبد خامشی کا در بھی کھلتا ہے اور اس آدمی کا احوال بھی بخوبی جان لیتے ہیں جس کی ذات صدیوں کے ملبے تلے پڑی کراہ رہی ہے۔

"دن نکلتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
شہر بستے ہیں اجڑ جاتے ہیں

دستکیں، آہنی دروازے پر
سر کو ٹکرا کے پلٹ جاتی ہیں
گنبد خامشی گرتا ہی نہیں
چلتی رہتی ہے ہوا
کھیتوں میں، دالانوں میں
اور اپنے ہی تلاطم میں اتر جاتی ہے
ہر طرف پھول بکھر جاتے ہیں
دل کی مٹی پہ کوئی رنگ اترتا ہی نہیں"

(تم جو آتے ہو)

روح عصر کی شناخت اپنے عصر کی شناخت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہی حیلہ ہے جو کارگر ہے۔ شعری واردات ان تجربات کی بھی مرہون منت ہوا کرتی ہے، جو ذات کے گرد و نواح میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ بس ایک کھرے فنکار کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ جہاں وہ عصری مسائل کو اپنا پس منظر بناتا ہے وہاں اس کی اپنی ذات بھی ایک اہم ترین عنصر کے طور پر نمودار ہوتی ہے جسے موجودہ حالات ایک مخصوص شکل دینے کا جبر پیدا کرتے ہیں۔ یہی اس کے اسلوب کی انفرادیت کا معیار ہوتا ہے اور یہی اس کا امکان ہوتا ہے——

ابرار احمد نے اپنے عصر کو اپنی بعض نظموں میں خوب پہچانا ہے۔ "میں رستے کو دیکھ رہا ہوں" اس کی ایک ایسی ہی نظم ہے جو ہمارے سامنے اس منظر کو کھولتی ہے جس کی متعفن فضا میں سانس لینا بھی دشوار ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ چاندی جیسے چہروں والے ڈری ہوئی امیدوں کے ساتھ دھندلی آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کیئے کسی اچھے لمحے کے منتظر کھڑے ہیں جبکہ ہیلمٹ والے، لوہے کے دستانوں والے، ننگے ٹخنوں اور سبز عماموں والے ہاتھوں میں پتھر لئے ہر پل اپنا محاصرہ تنگ کیئے جاتے ہیں—— مذہبی، تہذیبی اور سیاسی جبر کی یہ مکروہ صورت اسے مختلف کیفیتوں میں مبتلا کرتی ہے وہ تلملاتا ہے جھنجھلاتا ہے پژمردگی کا شکار

ہو جاتا ہے۔ اسے جادو کی ایسی چھڑی درکار ہے جو اس ناقابل برداشت منظر کو بدل سکے۔ وہ ایسی بارشوں کا منتظر ہے جو غلاظتوں کو دھو سکے اور انسان کی اس امید کو بار آور کر سکے جو وہ اپنی بقا اور توقیر کے لئے ازل سے روشن کئے ہوئے ہے ـــــ مگر گرد و پیش کا ماحول کسی سمت بھی کوئی رستہ نہیں دیتا۔ "اکتائے ہوئے دوست سے" "خود کلامی" "تم کہاں تک گئے" "آخری دن سے پہلے" اور "تیری دنیا کے نقشے میں" ـــــ اس کی چند ایسی ہی نظمیں ہیں جو اس کی بے حاصلی کو اور بھی گہری کرتی ہیں اور وہ سوچتا ہے کہ شاید یہی مقسوم ہے اور شاید گدا کے ہاتھ میں ہمیشہ ہی ٹوٹا ہوا کاسہ رہے گا ـــــ اور اگر ایسا ہے تو پھر کسی دھوکے میں کیا رہنا۔ یہ حالات کی اس سنگینی کا شاخسانہ ہے کہ وہ کسی کسی وقت الگ ہو کر بیٹھ جانے میں ہی عافیت پاتا ہے کہ ردعمل کی یہ بھی ایک صورت ہے ـــــ اور پھر ایک فقیر' ایک شاعر اس کے سوا اور کرے بھی کیا ـــــ؟

میں دیوار کی طرح
اپنی کائی سے کام رکھتا ہوں
اذیت کوشی اور تذلیل نے
میرے دماغ کو ماتھا بنا دیا ہے
اتنا ترس کھا چکا ہوں
کہ میرا جسم بھر گیا ہے
میری نفرت کی گرفت میں
موسموں کے سانس اکھڑ گئے ہیں
میں نے اپنے پاؤں توڑ لئے ہیں
اور اپنے ہی سائے پر بیٹھ گیا ہوں
اور دنوں کے ملبے سے
ٹوٹے کھلونے اور منہدم زمانے اٹھائے ہوئے

آتی جاتی ہوا کو گالیاں دیتا رہتا ہوں
ایک پاگل شور
میرے تعاقب میں ہانپتا چلا آ رہا ہے ——
(نظم)

منہدم زمانے' معدوم علاقے اور آتی جاتی ہوا کے انکشافات اس فکر کا نتیجہ ہیں جو موجودہ عہد کے انسان کو سمجھنے اور اپنی ذات پر پڑنے والے اثرات کے لئے اسے درکار ہوئے —— اس کے عہد کی شعری صورت حال تو یہ ہے کہ عقلیت پسندی تابناک مستقبل کاتنے سے ہی فراغ نہیں پاتی جب کہ اسے آدمی کا سفر ہر پل رائیگاں ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے سامنے عہد در عہد ایک ہی طرح کا منظر کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے اور ہوا اپنے جلو میں کوچ مکان لے کر اذیت روز و شب میں ہونے کی ذلتوں میں نڈھال صبحوں کی کہانی سناتی ازل اور ابد کے درمیان بہتی پھرتی رہتی ہے۔ جدید حسیت اور کیا ہے؟

جدیدیت اپنے درست معانی میں ایک عالمگیر رو تھی جو زوال آدم کو اپنا محور بناتی تھی —— مغرب میں اٹھنے والی تحریکوں کو یہ فکر دامنگیر ہوئی تھی کہ انسان کی ذات درمیان میں سے غائب ہونے لگی ہے۔ جدید تہذیب نے جو مختلف النوع جذباتی نفسیاتی اور ذہنی پیچیدگیاں پیدا کی تھیں وہ ایک آفاقی سوال پر جا کر منتج ہوتی تھیں ساٹھ کی دہائی میں نئی نظم میں جو ہمارے ہاں تصادم' کشمکش' فراریت' مغائرت' اجنبیت اور ناراضگی کے عناصر نمایاں دکھائی دیتے ہیں وہ بلاشبہ خود ہمارے اپنے سماج کے پیدا کردہ تو تھے مگر اپنی ہمہ گیری میں آفاقی وسعت بھی رکھتے تھے۔

ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں جدیدیت کو ترقی پسند ادب کی ضد سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ خیال اس سبب سے تھا کہ دونوں طرف ایسے گروہ موجود تھے جو ادب کو یا تو کاملاً" داخلیت کا کام تصور کرتے تھے یا خارجیت کا —— دونوں کے درمیان ربط کی کوئی صورت نہ تھی —— مگر جب تقسیم

کے بعد ترقی پسند تحریک پر پابندی عائد ہوئی اور سماجی حقائق نے ایک نئی شکل اختیار کی تو نظم نے فلسفہ وجودیت کی طرف اپنی رغبت بڑھا لی۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ تھا کہ فلسفہ وجودیت عقلیت پسندی سے گریز کے باوجود نہ صرف یہ کہ فرد کی آزادی کا حق تسلیم کرتا تھا بلکہ اس آزادی کے تعین کے لئے خارج کی طرف بھی دیکھتا تھا۔ یوں گویا داخلیت اور خارجیت کے درمیان ایک واسطہ استوار ہوا ـــــ ستر کی دہائی میں ایک ارتقاء البتہ یہ ہوا کہ انسان کی زبوں حالی پر تفکر کرنے کے لئے "نو ترقی پسندی" کی اصطلاح کو مقبولیت حاصل ہو گئی ـــــ کچلے ہوئے روندے ہوئے مظلوم لوگوں کا انبوہ جس انصاف کا طلب گار تھا وہ عصری حسیت تھی ـــــ انسان کی بے مائیگی' لاحاصلی تخلیقی فنکار کے لئے بہت سے مسائل لے کر آئی اس طرح وجود عصر حتیٰ کہ زندگی اور موت کے معانی بھی اپنی ہیئت بدلنے لگے۔

ابرار احمد ان معانی میں ضرور ایک وجودی شاعر ہے کہ اس کی ذات کو بھی تنہائی اور بیگانگی کا عارضہ لاحق ہے۔ فلسفہ وجودیت میں ہائیڈیگر سے سارتر تک بات تو شعور ذات ہی کی ہے۔ یہی تنہائی کا المیہ پیدا کرتی ہے اور یہی سرگرم بھی رکھتی ہے۔ اس سرگرمی میں فرد کی ذات جب شے کے مترادف ہوتی ہے تب ذلت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور لوٹ جانے کو جی کرتا ہے۔ ابرار احمد کے ہاں یہ احساس بعض سطحوں پر اس ہزیمت کا پیدا کردہ ہے جو معمول کا مقسوم ہے۔ یہ اسی معمول کا شاخسانہ ہے کہ اس کی فکر میں یہ الجھن بار بار نمودار ہوتی ہے کہ اس طرح ہونا تو ایک ذلت ہے ـــــ بلکہ ہونا ہی ایک ذلت ہے ـــــ شاید یہی بات اسے عدم کی طرف رغبت دلاتی ہے۔ کامیو نے کہا تھا۔

Why are we here' all of us condemned to death

لوٹ جانے کی خواہش سے پہلے ابرار احمد زندگی کی کئی ہزیمتوں سے گذرتا ہے مگر یہی ایک بات اس کے تجربے میں آتی ہے کہ ہرچند ہر شے بدلنے کی حرکت میں ہے مگر بدلتا کچھ بھی نہیں ـــــ جب بدلتا کچھ بھی نہیں تو پھر

اس دنیا اور اس وجود سے کیا علاقہ رکھنا ـــــــ بس یہیں سے اس کا ایک نیا سفر آغاز ہوتا ہے جو وجود سے عدم اور حقیقت سے خواب کی طرف مراجعت کے دروازے وا کرتا ہے اور گذشتہ کی آسودگی اور طمانیت کی عدم موجودگی تاسف میں ڈھل جاتی ہے ــــــ یہ ایک ALLIEN کی کہانی ہے۔

"کون سے دیس کی بابت پوچھے
وقت کے دشت میں پھرتی
یہ خنک سرد ہوا ـــــــ
کن زمانوں کی یہ مدفون مہک
بدنما شہر کی گلیوں میں اڑی پھرتی ہے"

اور پھر یہ بھی کہ ــــــ

"ہم کہ کس دیس کی پہچان میں ہیں
ہم کہ کس لمس کی تائید میں ہیں
ہم کہ کس زعم کی توفیق میں ہیں
ہم کہ اک ضبط مسلسل ہیں
زمانوں کے ابد سے لرزاں
وہم کے گھر کے مکیں
اپنے ہی دیس میں پردیس لئے پھرتے ہیں
ہم کہ اک بھیس لئے پھرتے ہیں"

(ہم کہ اک بھیس لئے پھرتے ہیں)

دیس اور پردیس کی اس نئی تعبیر ہی سے ابرار احمد کی نظم اپنا رستہ بناتی ہے اس کا گرد و پیش کئی غلاظتوں سے لتھڑا ہوا ہے جو آدمی کو بیزار کر دینے کے لئے کافی ہے۔ معاشرتی اور سماجی استحصال آمریت کا جبر' یکسانیت کی سڑاند' طبقاتی تضادات' مذہبی منافرتیں' قومی اور بین الاقوامی سطح پر پھیلتے ہوئے مسائل خوف اندیشے اور خطرات اور اس پر مستزاد اپنے اصل سے دور لے جاتی ہوئی

زندگی ــــــ یہی گدلایا ہوا منظر بد نما شہر کی گلیوں میں اسے ALLIEN ثابت کرتا ہے تب کوئی یاد اسے گھیر لیتی ہے دھند اور خواب میں چھپی ہوئی کوئی قدیم خوشگوار یاد ــــــ پھر وہ زمانوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے اس مسرت کو تلاشتا ہے جو کھوئی گئی تھی۔ اس کا سماج چاہے انقلاب فرانس کے دور سے مماثل نہ ہو مگر اپنے اندر انارکی تو رکھتا ہے۔ اس طرح وہ روسو کا ہمزاد نہ ہوتے بھی موجود سے بیزاری اور اکتاہٹ میں کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے کہ مسرت کی تلاش تو اسے بھی ہے ــــــ سو یہ نیند میں چلنے کا عمل ہے۔

"میں ــــــ دنیا سے ایسے گزرتا ہوں
جیسے کوئی نیند سے گزرتا ہے۔"

سارتر کے ناول LA -- NAUSEA کے کردار ROQUENTIN پر دنیا جس طرح کھلی تھی کسی حد تک ابرار احمد کے لئے بھی گرد و پیش یہی کیفیت لاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ سارتر کا کردار متلی کا شکار ہے جب کہ یہاں معاملہ اور ہے ابرار احمد کو نیند گھیرے میں لئے رہتی ہے۔

نیند ابرار احمد کا ایک مسلسل استعارہ ہے۔ یہ وہ حالت ہے جو اسے موجود کی ذلت سے نجات دلاتی ہے۔ وہ روز مرہ کی خرافات سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ کسی ایسے خواب میں ہے جو کہیں درمیان میں سے شکست ہوا۔ وہ جنت جس سے اسے نکالا گیا وہ زمانے جن سے وہ جدا ہوا' وہ بچپن جو قصبے کے گلی کوچوں میں کھیلتا رہ گیا ــــــ وہ آنکھیں' وہ ہاتھ' وہ موسم ــــــ اور وہ تمام شفاف اور پاکیزہ جذبے جو زندگی کی ہمہ ہمی آغاز ہونے سے پہلے آدمی کے وجود کا حصہ ہوتے ہیں ان کی طلب ابرار احمد کی شاعری کا ایک مسلسل موضوع ہے ــــــ وہ آدمی کی زندگی کو دو حصوں میں دیکھتا ہے ایک وہ کہ جس پر وہ قادر ہے اور ایک وہ کہ جس پر اسے کوئی قدرت حاصل نہیں ــــــ گرد و پیش' وقت اور زمانہ اس کی قدرت سے باہر ہیں وہ ان میں شریک تو ضرور ہے

مگر ان میں رہتے ہوئے اس کے وجود کو ایک محرومی' ایک تشنگی کا شدید احساس بھی ہے ـــــــ یہی سبب نیند کا ہوا۔

یہ بات جاننے کی ہے کہ نیند ابرار احمد کے ہاں فرار کا راستہ نہیں ہے بلکہ سپردگی کا تصور بھی ہے جو ہمیشگی میں ڈھلتا ہے یہ تصوف کی جہت ہے اس طرح ایک اعتبار سے نیند اس کے ہاں جاگنے کے معانی میں بھی آتی ہے اس طرف آنکھیں کھولنے کے معانی میں جو ماورائے حواس ہے۔

"وہ جو ماورائے احساس ہے
اسے روز و شب کے حساب سے
کروں بے دماغ میں کس طرح
کوئی آنسوؤں کی زبان نہیں
کوئی ماسوائے گماں نہیں
یہ جو دھندلی آنکھوں میں ڈوبتا کوئی نام ہے
یہ کہیں نہیں' یہ کہاں نہیں ـــــــ؟
یہ قیامِ خواب' دوامِ خواب
رہوں اس سے دور میں کس طرح
انہی ساحلوں پہ
تڑپتی ریت میں سو رہوں
مجھے اذنِ ذلتِ ہست ہو ـــــــ!"

(پس منظر کی آواز)

"پکی گندم کے خوشوں میں
اڈتے دن کے ڈیروں میں
اندھیرے کی گھنی شاخوں
پرندوں کے بسیروں میں
تھکے بادل سے گرتے نام کے اندر

اترتی شام کے اندر
دوام وصل کا اک خواب ہے
جو سانس لیتا ہے"

(دوام وصل کا خواب)

"ایک خواب ہزیمت دنیا
ایک آہٹ دوام خواہش کی
ایک جوڑی قدیم ہاتھوں کی
اور آنکھوں کے بند فرغل میں
ایک خواہش ہمیشہ رہنے کی"

(موت دل سے لپٹ گئی اس شب)

ابرار احمد کے ہاں I Return From him to him کی کیفیت جو ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ آتی رہتی ہے وہ اردو شاعری کی اپنی تخلیقی روایت کے ساتھ جڑی ہے اسی لئے یہ کہنا آسان ہوا ہے کہ اس کی وجودیت مغربی ادب سے مستعار نہیں بلکہ تصوف اور رومانویت کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ دونوں عناصر مشرقی مزاج کے غماز ہیں اور یہی انسان دوستی کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔

نئی ادبی تحریکوں کے زمانے میں ہمارے ہاں وجودیت کا جو غلغلہ اٹھا تھا اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ہمارے سامنے جدید عہد کو سمجھنے کے لئے مغرب کے سوا اور کوئی مثال ہی نہ تھی۔ سارتر جو وجودیت کا علم بردار تھا اور فرانسیسی نو آبادیوں پر گزرنے والے شب و روز پر نوحہ کناں بھی رہتا تھا ایک معیار اور ایک سانچہ بن گیا تھا——— اس میں کچھ قباحت تو نہ تھی مگر مشکل یہ ہوئی کہ جب ہماری مقامی صورت حال میں نت نئے پیچ پڑے اور یہاں کے آدمی کی ذات نے ذرا مختلف نوع کی صورت اختیار کی تو فیشن پرست شاعر مغرب کے بنے بنائے نظریات اور معیارات سے باہر نہ آسکا اس سے خود اس پر جو گزری یا

گزر رہی ہے وہ تو الگ تفصیل کی طالب ہے مگر نظم کی اپنی تخلیقی روایت کے ارتقاء کا راستہ اور بھی دشوار ہوا اور "نظم" کہنے والے کم ہو گئے۔

ابرار احمد کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے تناظر میں رہتا ہے اور گرد و پیش سے کٹ کر کتابی مطالعے سے مواد چننے سے انکار کرتا ہے۔ منظر نامہ اس کے سامنے ہے اب یہ اس کی اپنی ترجیح ہے کہ وہ اس میں سے اپنے لئے کیا انتخاب کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تنہا اور بے آسرا لوگ ہی تصوف کی طرف جلدی مائل ہوتے ہیں لیکن یہ تو طبع اور مزاج کی بات ہے۔ ابرار احمد کے ہاں معاشرتی دباؤ نے جو قضیہ پیدا کیا تھا وہ فطرت سے ہم آہنگ ہونے اور ابدیت سے دوام وصل کا باعث بنا ہے اور اس سارے تفکر میں اس کی رومانویت اس کے کام آتی ہے ——— رومانویت کا تصور تو خیر وجودیت میں بھی موجود ہے Emotionalism -- Hyper حساس طبیعتوں کا ایک مظہر ہوتا ہے اسی لئے تو وہ دکھ' درد' تنہائی' بیزاری اور الجھنوں میں مبتلا ہوتے ہیں مگر ابرار احمد کے ہاں سوگواری کی کیفیت میں اس وقت آسودگی اور اطمینان بھی در آتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو اس خواب کے سپرد کرتا ہے جس میں نرمی ملائمت اور گداز کی آسائش گھلی ہوئی ہوتی ہے۔ سو وہ ہجر کی حالت میں بھی وصل کی کیفیت میں رہتا ہے۔ یہی متصوفانہ رجائیت ہے۔ مجید امجد نے اپنے واحد ٹیلیویژن انٹرویو میں کہا تھا کہ میں لکھنے میں اس مسرت کو تلاش کرتا ہوں جو اس دنیا اور کائنات سے مفقود ہوتی جاتی ہے۔ ابرار احمد بھی کچھ ایسا ہی کرتا ہے۔

ابرار احمد کی نظم جدید زندگی کے متنوع موضوعات سے عبارت ہے مگر یہ بات توجہ طلب ہو گی کہ اس کے خوابوں کا خمیر شہری زندگی کی اتھل پتھل سے ترتیب نہیں پاتا بلکہ فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہوا پرسکون اور آسودہ ماحول کا لینڈ سکیپ مرتب کرتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ نئی نظم کا بیشتر منظر نامہ شہری زندگی سے پیدا ہونے

والے تفکرات سے بنا ہے۔ جدید عہد میں تہذیبی سطح پر جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں انہوں نے انسان کے داخل کو نیا رخ دینے میں اپنا کام دکھایا ہے۔ انسان کے زوال کی کہانی اصل میں تہذیب کے زوال یا تہذیب کے ایک نئے رخ کو مڑ جانے کی کہانی ہے اور "شہر" اس کا استعارہ ہے۔ تنہائی اور مغائرت اسی شہر کے گلی کوچے ہیں۔

ساٹھ کی دہائی کی نظم میں شہر کا استعارہ ایک کلیدی لفظ رہا ہے۔ ہم نئی نظم میں شہر کی کربناکیوں اور ہولناکیوں کو اکثر موضوع بنتا دیکھتے رہے ہیں۔ یہ ایک طرح سے فرد کی ذات پر پڑنے والے دباؤ کا احتجاج تھا۔ بعد کی دہائیوں میں اس لفظ کی وسعتوں میں کچھ اور بھی اضافہ ہوا ہے ابرار احمد نے اس استعارے سے ہمہ جہتی کام لیا ہے وہ اس استعارے کو براہ راست حوالہ بنانے کی بجائے اسے بالواسطہ بھی استعمال میں لاتا ہے اور اپنے عہد کے خصائص کو بھی اجاگر کرتا ہے جو بدلتی ہوئی تہذیبی حقیقتوں سے وابستہ ہیں۔ اس طرح اس کی شاعری معنوی اعتبار سے اپنا ایک امتیازی وصف بھی بناتی ہے۔

جدید تہذیب نے ایک تو یہ کیا تھا کہ صنعتوں کے احیاء کے ساتھ ہی آدمی کا زمین سے رشتہ کمزور ہونے لگ گیا تھا۔ ایک زمین ہی کیا فطرت اور آدمی تک سے اس کے تعلق نے نئی شکل اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ یہ جو نیا سماج بن رہا تھا اس میں آدمیوں کا رخ شہروں کی طرف تھا اور اب بھی ہے۔ یہ ہجرت کلچر کی ہجرت بھی تھی۔ ابرار احمد کی شاعری اسی المیے کے ساتھ ربط پیدا کرتی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے اس کے لئے "شہر کا ہونا" تکلیف کا باعث نہیں بلکہ "شہر میں ہونا" تکلیف کا باعث ہے۔

تھی صبح کس زمیں پر
اور شب کہاں پہ آئی
مٹی تھی کس جگہ کی
اڑتی پھری کہاں پر (مٹی تھی کس جگہ کی)

تقسیم کے بعد ہمارے ہاں شہروں کی طرف نقل مکانی کا عمل تیز ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ستر کی دہائی کی شاعری میں دریا' آسمان' درخت اور پرندے وغیرہ جیسے الفاظ ایک خاص نسٹالجک انداز میں استعمال ہوتے دکھائی دیتے ہیں جو پیچھے مڑ کر دیکھنے کا عمل ہے البتہ ابرار احمد کی تخصیص یہ ہے کہ اس کے ہاں اپنا چھوڑا ہوا منظر نامہ محض جزوی طور پر نہیں آتا نہ ہی صرف منظر نگاری کی شکل میں رہ جاتا ہے بلکہ یہ ایک طرز احساس ہے جو اس کی پوری شاعری میں سرایت کیا ہوا ہے ہمیں اردو شاعری میں اس نوع کی اور کوئی ایسی مثال نہیں ملتی۔ یہ انفرادیت صرف ابرار احمد ہی کا حصہ ہے کہ اس نے قصباتی زندگی کے نقوش کو ایک سائیکی کے طور پر پیش کیا۔



"ہم آئیں گے<br>
نیند اور بچپن کی خوشبو میں سوئی ہوئی<br>
تیری راتوں کی چھت پر<br>
اجلی چارپائیاں بچھانے<br>
موتیے کے پھولوں سے پرے<br>
اپنی چیختی تنہائیاں اٹھانے<br>
ہم۔ لوٹیں گے تیری جانب<br>
اور دیکھیں گے تیری بوڑھی اینٹوں کو<br>
عمروں کے رتجگوں سے دکھتی<br>
آنکھوں کے ساتھ<br>
اونچے نیچے مکانوں میں گھرے<br>
گذشتہ کے گڑھے میں<br>
ایک بار پھر گرنے کے لئے<br>
لمبی تان کر سونے کے لئے

ہم ۔ آئیں گے
تیرے مضافات میں
مٹی ہونے کے لئے ۔۔۔۔۔!"

(قصباتی لڑکوں کا گیت)

ابرار احمد اپنے پیچھے ایک ثقافت کو معدوم ہوتے اور دم توڑتے دیکھتا ہے اور اسے موضوع بناتا ہے جسے شاید کل کوئی شناخت بھی نہیں کرے گا۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ورثے کو محفوظ کرنے کے فرض سے بھی سبکدوش ہوا ہے۔

قصباتی زندگی سے تعلق نے ابرار احمد کو اپنا شاعرانہ مزاج بنانے میں بھی بڑی مدد دی ہے۔ اس کی سبک لفظیات ایک طرف تو اسے فطرت سے قریب تر رکھتی ہے تو دوسری طرف بچپنے کے آنگن اور لڑکپن کی گلیاں حافظہ مرتب کرنے میں مددگار ہوتی ہے چونکہ اس کی بنیادی قدر عشق ہے لہٰذا اس نوع کا لسانی پیرایہ اسے ایک مخصوص ترنگ میں رکھتا ہے وہ بظاہر سادہ لفظوں سے کام لیتا ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ محض ماحول سازی کر کے الگ ہو جاتا ہو بلکہ ان لفظوں کے استعاراتی روپ سے کام لے کر اپنا ایک الگ اسلوب وضع کرتا ہے جو اس کی نظم کی بنیادی شناخت ہے۔

شاعر کا تخیل اگر اپنے موضوعات سے میل کھاتا لسانی نظام نہ دے سکے تو ہر چیز بکھری ہوئی اور اجزا میں بٹی ہوئی منتشر دکھائی دے گی یہ منتشر خیالی کا شاخسانہ ہوتا ہے۔ ابرار احمد کے اکثر معاصرین کو یہی مخمصہ درپیش ہے۔ شعوری سطح پر کی گئی ترکیب سازی اور بے جوڑ تمثال نگاری نے عجلت پسندوں کو چونکانے کے عمل میں مبتلا کیا ہے۔ ابرار احمد نے مرعوب کرنے کے ان ہتھکنڈوں سے اسی لئے گریز کیا ہے کہ وہ شاعری کے ساتھ ایک واضح کمٹ منٹ رکھتا ہے اور اس کے اہداف واضح ہیں۔ اس نے کئی سامنے کے لفظوں کے کینوس کو وسیع کیا ہے۔ یہاں بطور خاص "ہوا" اور "بارش" کی مثال لی جا سکتی ہے۔ جو

تعین معانی سے باہر آتے اور ایک نیا استعاراتی رنگ اختیار کرتے ہیں۔

کھیتوں اور دالانوں میں ہونکتی پھرتی "ہوا" ابرار احمد کے ہاں "معدوم علاقوں اور منہدم زمانوں" تک رسائی کا ذریعہ ہے۔ اس کا تفصیلاً ذکر تو ابتدا میں ہو چکا ——— کچھ یہی عالم "بارش" کا بھی ہے۔

بارش کا ایک کام تو یہ ہے کہ ایک رومان پرور فضا تشکیل دینے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ اور ایک یہ کہ غلاظت کو دھوتی ہے ملمع اتارتی ہے منظر صاف ہو جاتے ہیں مگر ابرار احمد کی شاعری نے اس کے ایک اور معانی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

بارش ہماری زندگیوں میں ایک ایسا عامل بھی تو ہے جو معمول میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ زندگی کا عمل سست پڑ جاتا ہے۔ سو صوفیانہ مزاج کو جس نوع کی آہستہ روی درکار ہوتی ہے ابرار احمد اسے بارش کے عمل سے جنم دیتا ہے اور گرد و پیش کی اتھل پتھل سے فراغ حاصل کر لیتا ہے۔ گویا بارش ایک ایسی تحریک ہے جو خارج سے داخل کی طرف مڑ جانے کا راستہ کھولتی ہے۔ کھڑکیاں کواڑ بند ہو جاتے ہیں اور عقب میں جھانکنا آسان ہو جاتا ہے ———

تخلیقی عمل میں اشیاء کا ادراک تخیل کے اپنے مخصوص عمل ہی سے وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا الفاظ اپنے لغوی معانی سے جدا ہو کر ایک نئے معانی کی طرف بڑھتے ہیں مگر ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جب شاعر کا مجموعی رویہ اس کی تصدیق کرتا ہو۔ جب شاعر لفظوں کے انتخاب کے لئے شعوری سطح پر چھان پھٹک کرے تو پھر اس کی شاعری کا مجموعی مزاج تشکیل پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ابرار احمد کے ہاں اس کے متنوع موضوعات بھی اس لیے کسی ایک موضوع کا مختلف روپ بنتے ہیں کہ اس کا اسلوب اس کے تخیل اور اس کے مجموعی رویے کی مدد سے ادراک پیدا کرتا ہے ——— اس طرح ایک اعتبار سے اس کا اسلوب اس کی نظم کی ضرورت بھی ہے محض پہچان ہی نہیں ———

ابرار احمد کی شاعری نے سیاسی بحران کے زمانے میں آنکھ کھولی تھی اور

تہذیبی بحران کی خبر پائی تھی۔ اس کا سب سے بڑا نقصان محبت کی گمشدگی تھا۔ وہ علاقہ اور وہ زمانہ جو خوشیوں سے لبریز تھا کہیں دور دھند میں غائب ہوتا جاتا تھا جب کہ گرد و پیش میں بڑھتی ہوتی بھیڑ میں انسان کی بے توقیری اور تذلیل تازیانے کا کام کرتے تھے ـــــــ اس طرح گویا اس نے زمانے کے دکھوں کو اس طرح بیان نہیں کیا جس طرح کہ بظاہر وہ تھے بلکہ اس طرح بیان کیا جس طرح کہ اس نے انہیں اپنے وجود پر جھیلا۔ یہ اپنے موضوعات سے اس کے سنجیدہ تعلق کا ثبوت بھی تھا اور نظم کے مزاج سے آشنائی بھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ جو بات اسے اپنے ہم عصروں سے جدا کرتی ہے وہ یہی رویہ ہے کہ وہ اپنی نظم کا سرا وہاں جوڑتا ہے جہاں موجود روایت کی ڈوری ٹوٹتی دکھائی دیتی ہے اور ادھر کا رخ رکھتا ہے جہاں ایک نئے شعری امکان کی منزل اشارہ کرتی ہے۔

احمد جاوید

29 دسمبر 96ء
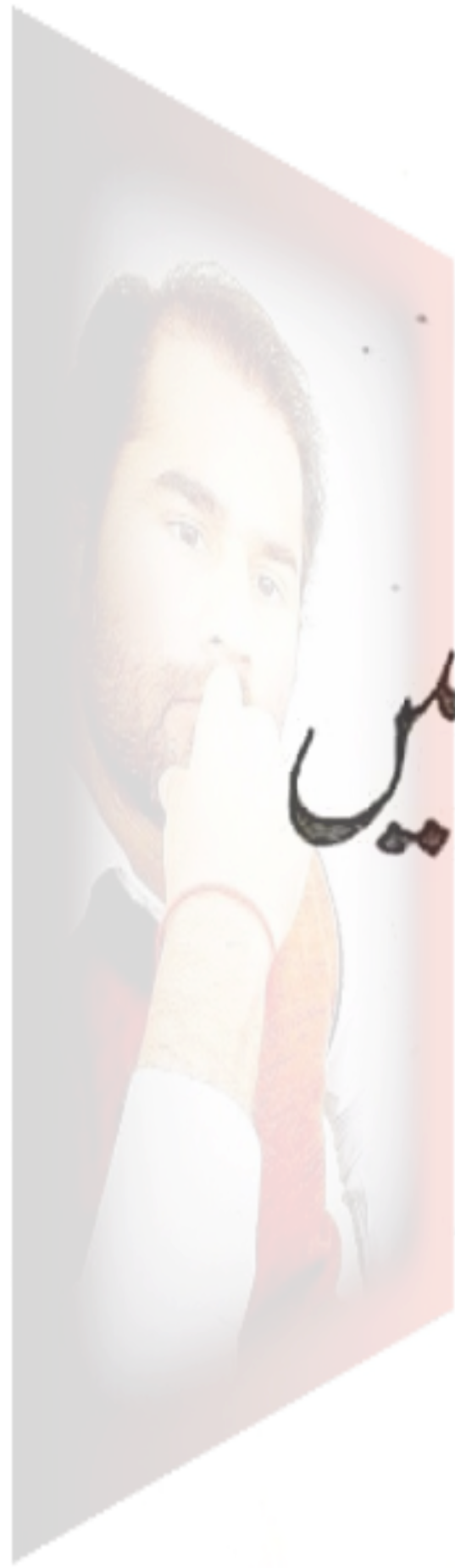
# تری دُنیا کے نقشے میں

تری دنیا میں جنگل ہیں
ہرے باغات ہیں
اور دور تک پھیلے بیاباں ہیں
کہیں پر بستیاں ہیں
روشنی کے منطقے ہیں ——
پہاڑوں پر اترتے بادلوں میں

رقص کرتا ہے، سمندر چار سو ــــــ
اسی انبوہ کا حصہ نہیں ہوں میں
کہاں ہوں میں؟
میں تیرے لمس سے اک آگ بن کر پھیلنا
تسخیر کی صورت، بپھرنا چاہتا تھا
اور اترا ہوں
کسی بے مہر سناٹے کے میداں میں
ہزیمت کی دہکتی ریت پر
بکھرا پڑا ہوں، شام کی صورت
میں جینا چاہتا تھا تیری دنیا میں
ترے ہونٹوں پہ کھلتے نام کی صورت
کہیں دشنام کی صورت
کہیں آرام کی صورت
میں آنسو تھا
تیرے چہرے پہ آ کر پھول دھرتا تھا
ترے دکھ پر
گرا کرتا تھا قدموں میں
اے چشمِ تر ــــــ کہاں ہوں میں؟

اندھیرے سے بھری آنکھوں میں
چلتی ہے ہوا، ہر سو
اور اڑتے جا رہے ہیں، راستے اس میں
زمانوں کے کناروں سے
ابد کے سرد خانوں تک
ہوا چلتی ہے، ہر سو
اور اس کی ہم رہی میں
دو قدم چلتا نہیں ہوں میں
ہجومِ روز و شب میں
کس جگہ سہما ہوا ہوں میں
کہاں ہوں میں؟
تری دنیا کے نقشے میں
کہاں ہوں میں ——— ؟
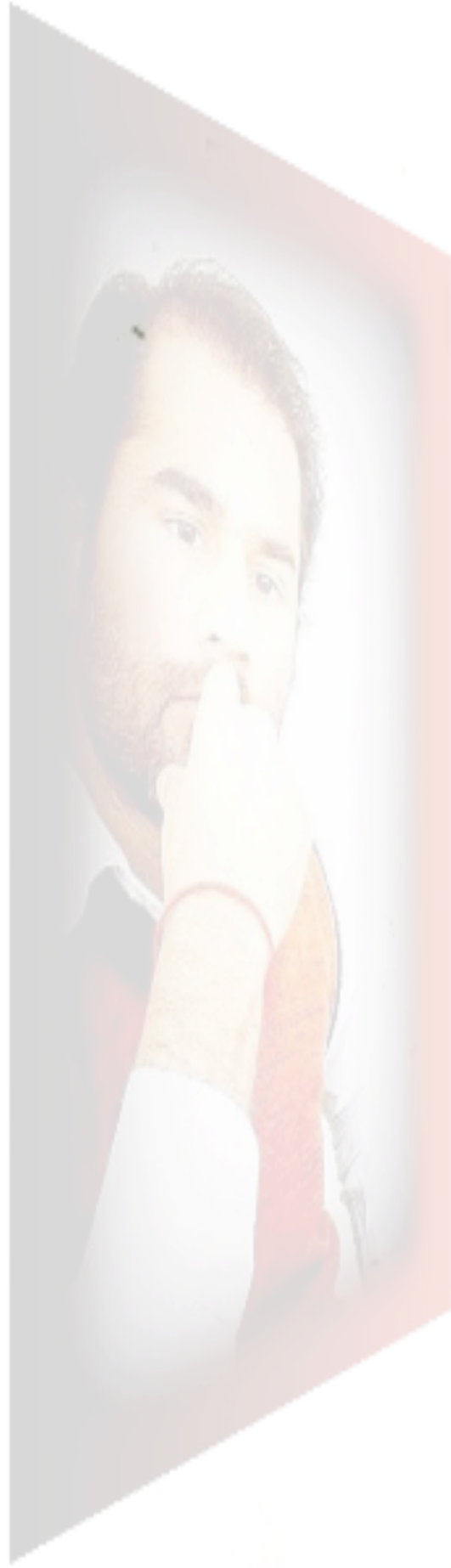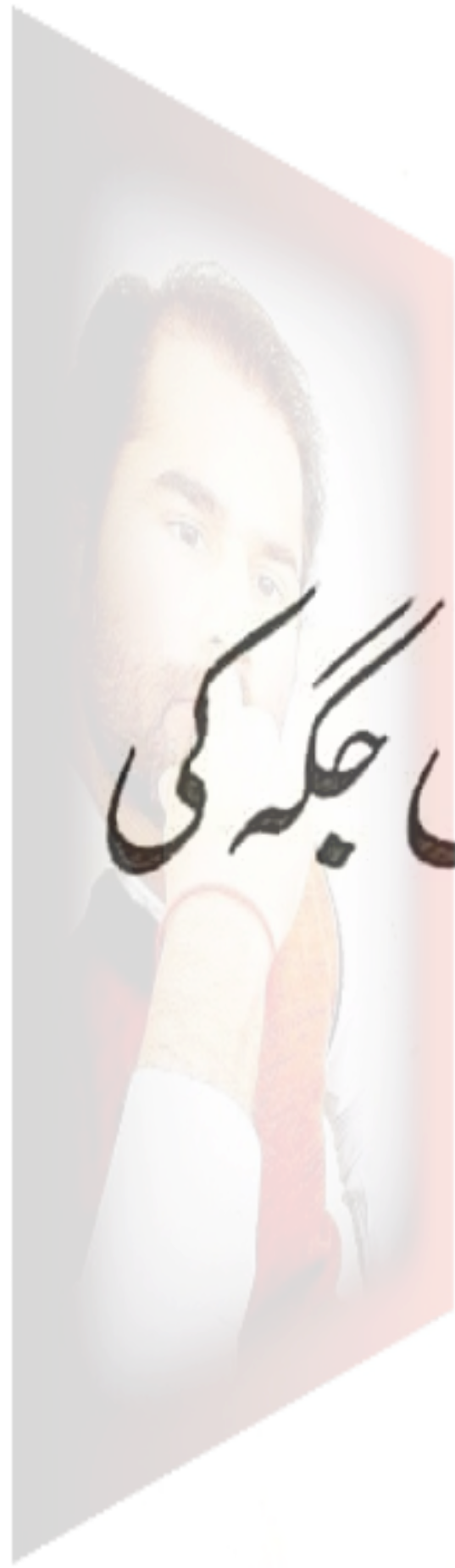
# مٹی تھی کِس جگہ کی

بے فیض ساعتوں میں
منہ زور موسموں میں
خود سے کلام کرتے
اکھڑی ہوئی طنابوں
دن بھر کی سختیوں سے
اکتا کے سو گئے تھے

بارش تھی بے نہایت
مٹی سے اٹھ رہی تھی
خوشبو، کسی وطن کی
خوشبو سے جھانکتے تھے
گلیاں، مکاں، دریچے
اور بچپنے کے آنگن
اک دھوپ کے کنارے
آسائشوں کے میداں
اڑتے ہوئے پرندے
اک اجلے آسماں پر
دو نیم باز آنکھیں
بیداریوں کی زد پر
تا حدِّ خاک اڑتے
بے سمت، بے ارادہ
کچھ خواب، فرصتوں کے
کچھ نام، چاہتوں کے
کن پانیوں میں اترے
کن بستیوں سے گزرے
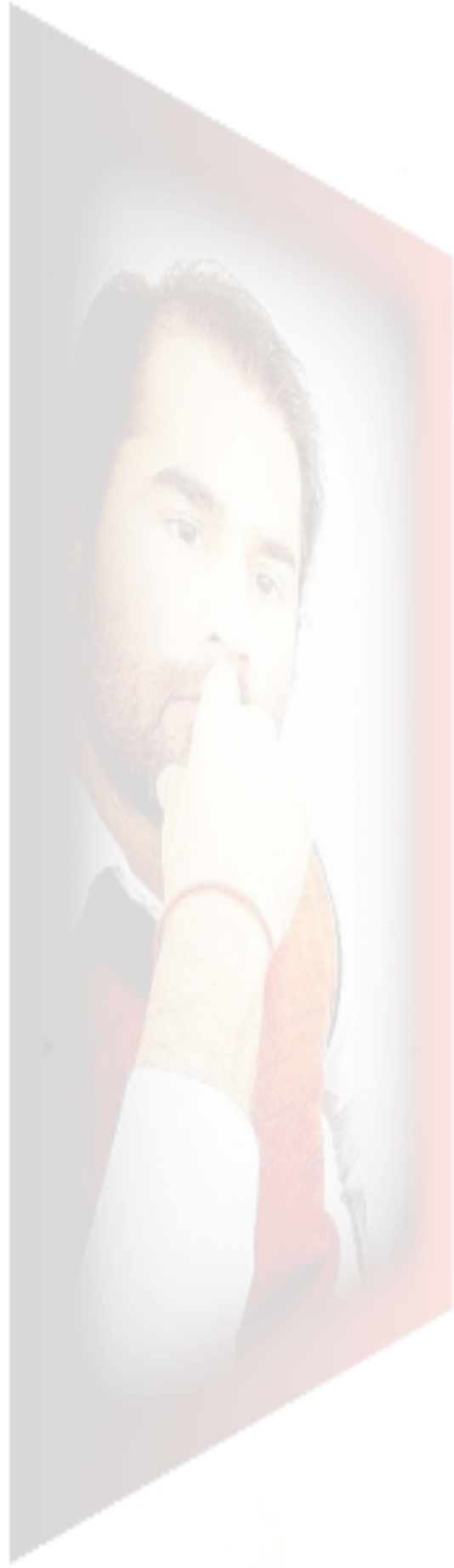
تھی صبح کس زمیں پر
اور شب کہاں پہ آئی
مٹی تھی کس جگہ کی
اڑتی پھری کہاں پر
اس خاک داں پہ کچھ بھی
دائم نہیں رہے گا
ہے پانو میں جو چکر
قائم نہیں رہے گا
دستک تھی کن دنوں کی
آواز کن رتوں کی
خانہ بدوش جاگے
خیموں میں اڑ رہی تھیں
آنکھوں میں بھر گئی تھی
اک اور شب کی نیندیں ——

اور شہرِ بے اماں میں
پھر —— صبح ہو رہی تھی

# تم جو آتے ہو

دن نکلتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
شہر بستے ہیں، اجڑ جاتے ہیں
دستکیں، آہنی دروازے پر
سر کو ٹکرا کے پلٹ جاتی ہیں
گنبدِ خامشی گرتا ہی نہیں
چلتی رہتی ہے ہوا

کھیتوں میں، دالانوں میں
اور اپنے ہی تلاطم میں اتر جاتی ہے
ہر طرف پھول بکھر جاتے ہیں
دل کی مٹی پہ کوئی رنگ اترتا ہی نہیں
"آنکھ نظّارۂ موہوم سے ہٹتی ہی نہیں"
ذہن ـــــ اس حجلۂ تاریکی و تنہائی میں
اپنے کانٹوں پہ پڑا رہتا ہے
وقت آتا ہے، گزر جاتا ہے ـــــ!



تم جو آتے ہو تو ترتیب الٹ جاتی ہے
دھند جیسے کہیں چھٹ جاتی ہے
نرم پوروں سے کوئی ہولے سے
دل کی دیوار گرا دیتا ہے
ایک کھڑکی کہیں کھل جاتی ہے
آنکھ۔ اک جلوۂ صد رنگ سے بھر جاتی ہے!
کوئی آواز بلاتی ہے ہمیں
تم جو آتے ہو
تو اس حبس، دکھن کے گھر سے
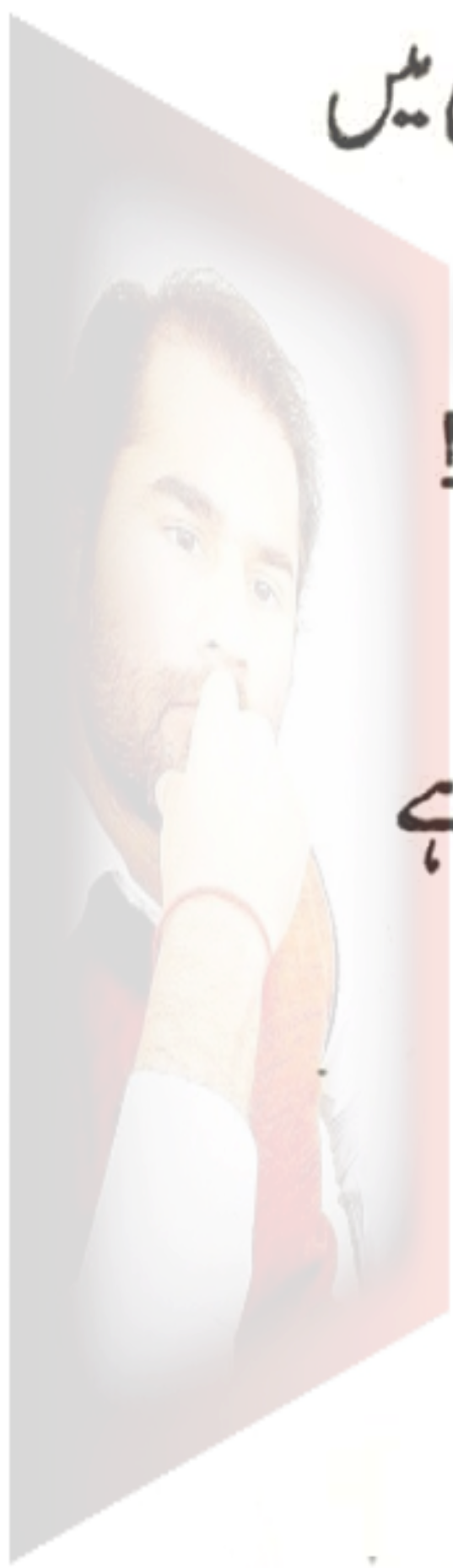
رنجِ آئندہ و رفتہ کی تھکاوٹ سے
نکل لیتے ہیں

تم سے ملتے ہیں
تو دنیا سے بھی مل لیتے ہیں!
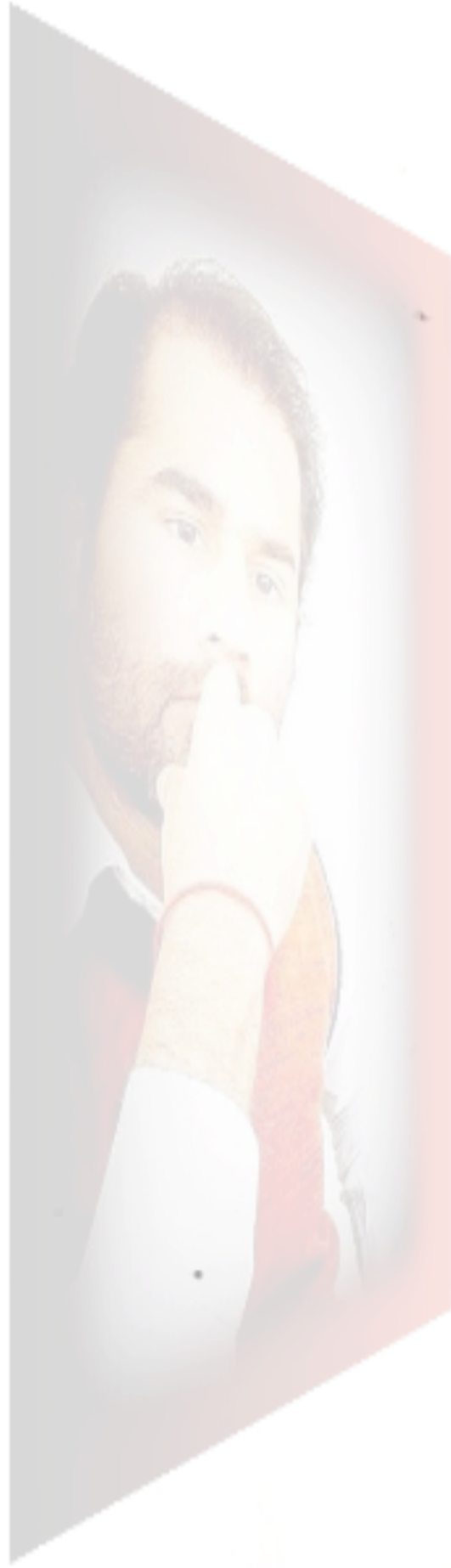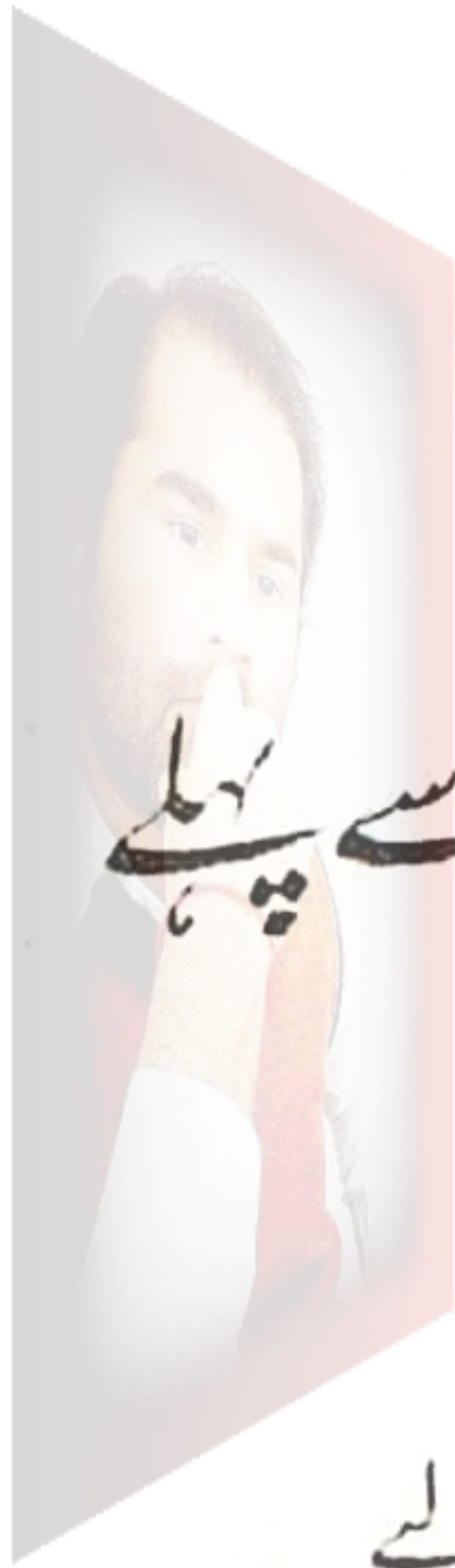
# آخری دن سے پہلے

بہت دن رہ لیا کوئے ندامت میں
ہزیمت کے بہت سے وار ہم نے سہ لیے
ترا یہ شہر، شہرِ جاں نہیں ہے
ترے اس شہر میں ـــــــ اب اور کیا رہنا
ہمارے خواب
تیرے خار و خس میں تھے

## ہمارے لفظ

تیری پیش و پس میں تھے
کہ ہم ہر سانس
تیری دسترس میں تھے
ترے اجلے دنوں سے
ہم کو کیا حصہ ملے گا
گدا کے ہاتھ میں
ٹوٹا ہوا کاسہ رہے گا
ہمیشہ کے لیے شاید
یہی قصہ رہے گا
اب اس دھوکے میں کیا رہنا
بہت دن رہ لیا کوئے ندامت میں!
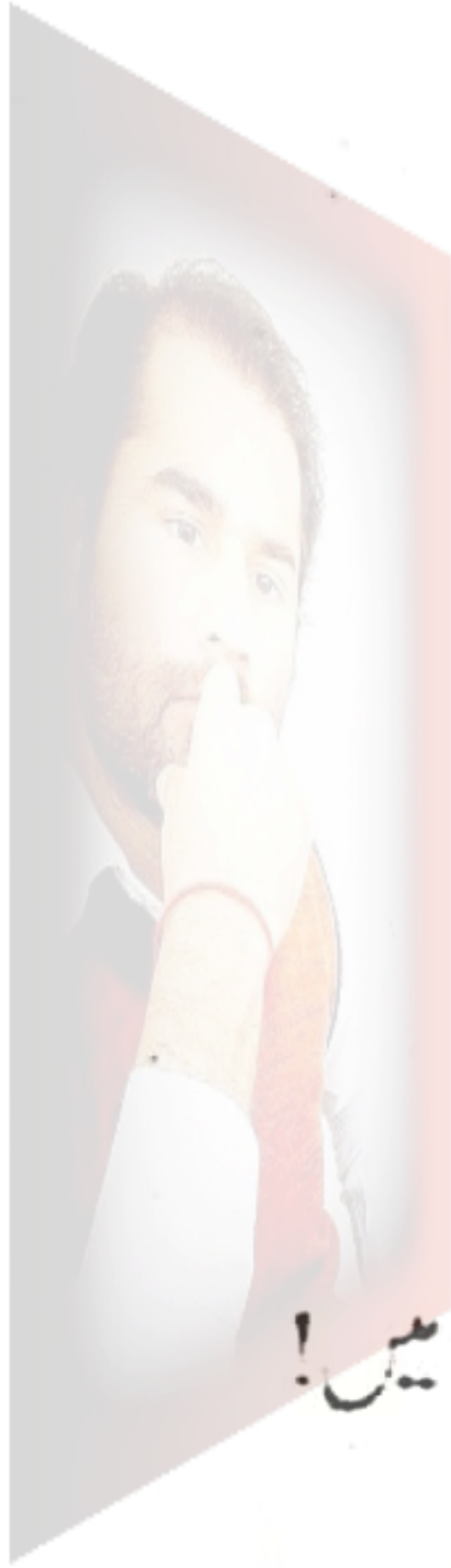
تو آفاق سے قطرہ قطرہ گرتی ہے
سناٹے کے زینے سے
اس دھرتی کے سینے میں
تو —— تاریخ کے ایوانوں میں در آتی ہے
اور بہا لے جاتی ہے
جذبوں اور ایمانوں کو

میلے دسترخوانوں کو ــــــ!

تو جب ــــــ بنجر دھرتی کے ماتھے کو بوسہ دیتی ہے

کتنی سوئی آنکھیں کروٹ لیتی ہیں

تو آتی ہے

اور تری آمد کے نم سے

پیاسے برتن بھر جاتے ہیں



تیرے ہاتھ بڑھے آتے ہیں

گدلی نیندیں لے جاتے ہیں



تیری لمبی پوروں سے

دلوں میں گرہیں کھل جاتی ہیں

کالی راتیں ڈھل جاتی ہیں



تو آتی ہے

پاگل آوازوں کا کیچڑ

سڑکوں پر اڑنے لگتا ہے

تو آتی ہے

اور اڑا لے جاتی ہے

خاموشی کے خیموں کو

اور ہونٹوں کی شاخوں پر
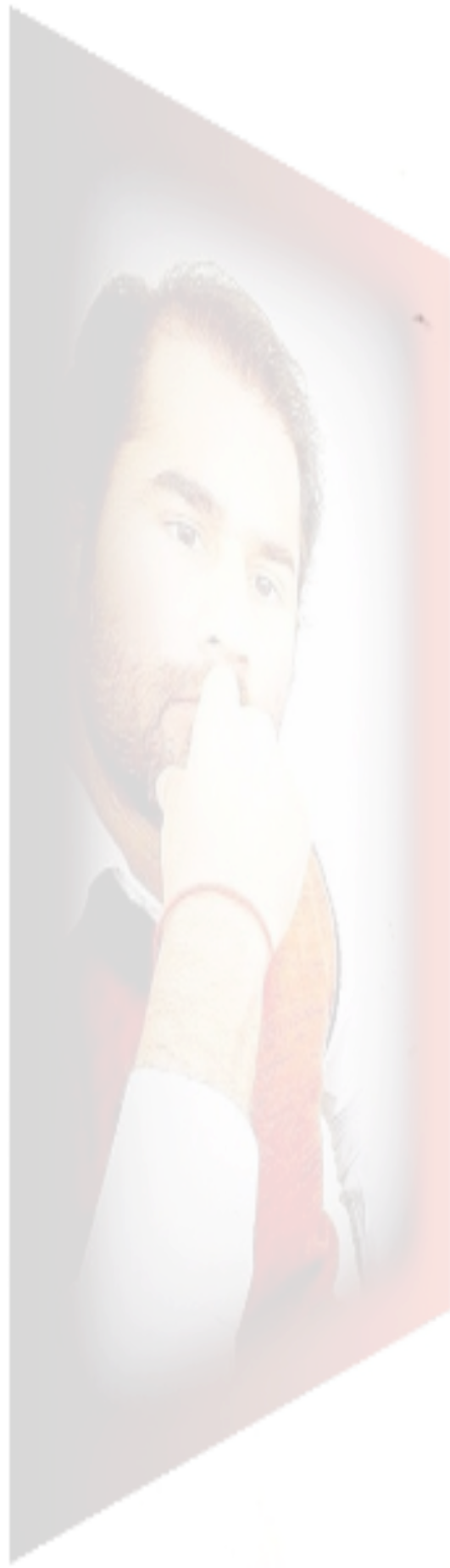
موتی ڈولنے لگتے ہیں
پنچھی بولنے لگتے ہیں
تو جب ——— بند کواڑوں اور دلوں پر دستک دیتی ہے
ساری باتیں ——— کہہ جانے کو جی کرتا ہے
تیرے ساتھ ہی
بہہ جانے کو جی کرتا ہے

# ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے

ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے
جلو میں کوچے مکان لے کر
سفر کے بے انت پانیوں کی تھکان لے کر
جو آنکھ کے عجز سے پرے ہیں
انہی زمانوں کا گیان لے کر
ترے علاقے کی سرحدوں کے نشان لے کر

ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے

زمین چپ

آسمان وسعت میں کھو گیا ہے

فضا' ستاروں کی فصل سے لہلہا رہی ہے

مکاں، مکینوں کی آہٹوں سے دھڑک رہے ہیں

جھکے جھکے' نم زدہ دریچوں میں

آنکھ کوئی' رکی ہوئی ہے

فصیلِ شہرِ مراد پر

نامراد آہٹ اٹک گئی ہے

یہ خاک تیری مری صدا کے دیار میں

پھر بھٹک گئی ہے

دیارِ شام و سحر کے اندر

نگارِ دشت و شجر کے اندر

سوادِ جان و نظر کے اندر

خموشیِ بحر و بر کے اندر

ردائے صبحِ خبر کے اندر

اذیت روز و شب میں

ہونے' کی ذلتوں میں نڈھال صبحوں کی

اوس میں بھیگتی، ٹھٹھرتی

خموشیوں کے بھنور کے اندر

دلوں سے باہر

دلوں کے اندر

ہوا۔ ہر اک سمت بہہ رہی ہے!
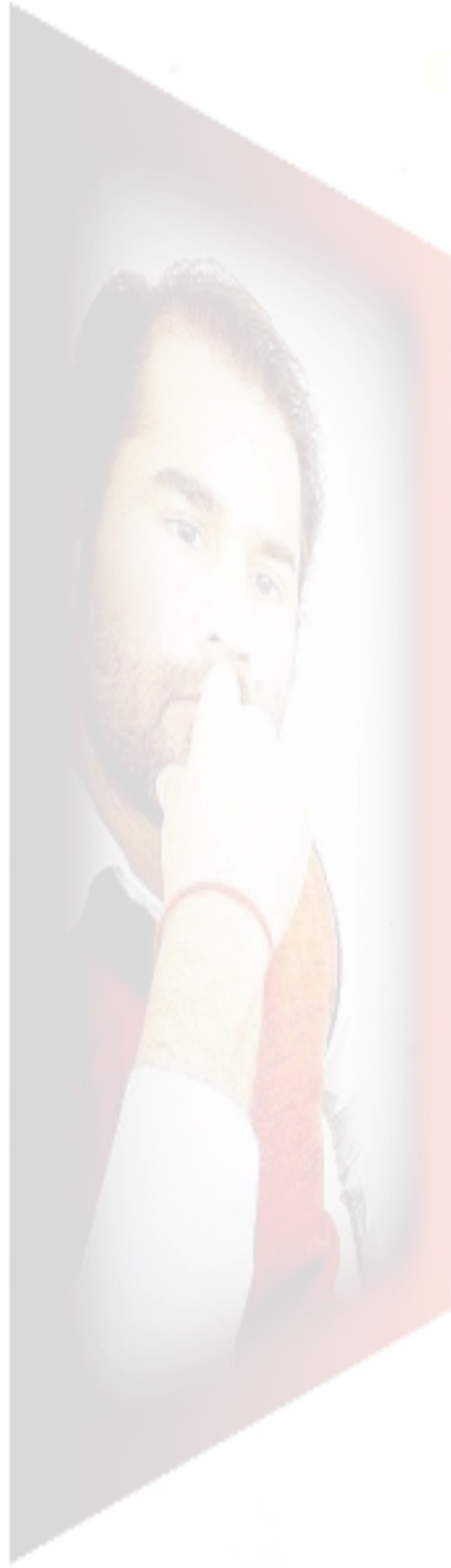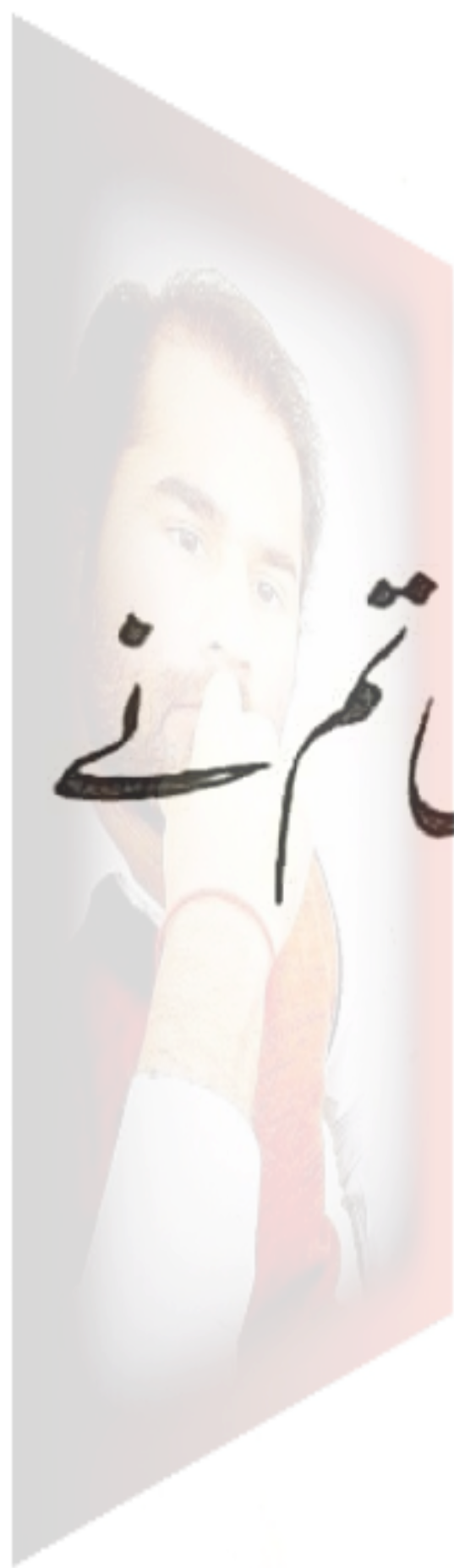
# دیر لگا دی تم نے



اس سے ملنا تھا
بہت دیر لگا دی تم نے
اے مری عمر!
بہت دیر لگا دی تم نے
میں نے سوچا تھا
کہ اس کارگہِ ہستی میں

چند سانس اپنی فراغت کے گھنے سائے میں
کھینچ پاؤں تو
اسی سمت چلا جاؤں گا
میں نے سوچا تھا
کہ اس موڑ تلک جاؤں گا
جس سے رستے
ابدیت کی طرف مڑتے ہیں
اور موجود کی ذلت سے پرے
دشتِ امکاں میں
درختوں سے لپٹ جاؤں گا
اپنے دن رات کے لفظوں کی کھلی بارش میں
بھیگ جاؤں گا
اسی نام کے سایے سایے
چلتا جاؤں گا، بہت دور تلک
وقت ——— روٹھا ہوا بچہ ہے
منالاؤں گا
تو نے اے عمر ——— سنبھلنے نہ دیا
اپنی غفلت کی تھکاوٹ سے
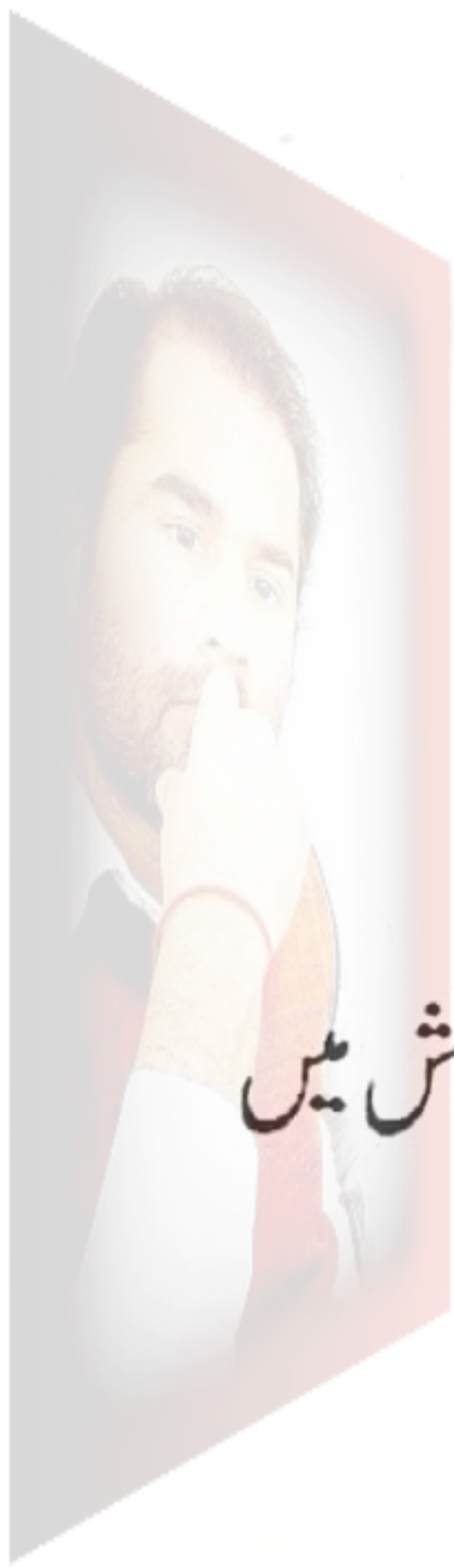
نکلنے نہ دیا
خواب کے بیچ
جو اک اسم کا دروازہ تھا
کھولتے کھولتے
ہر سانس گنوا دی میں نے
اے مری عمر ـــــــ بہت دیر لگا دی تم نے
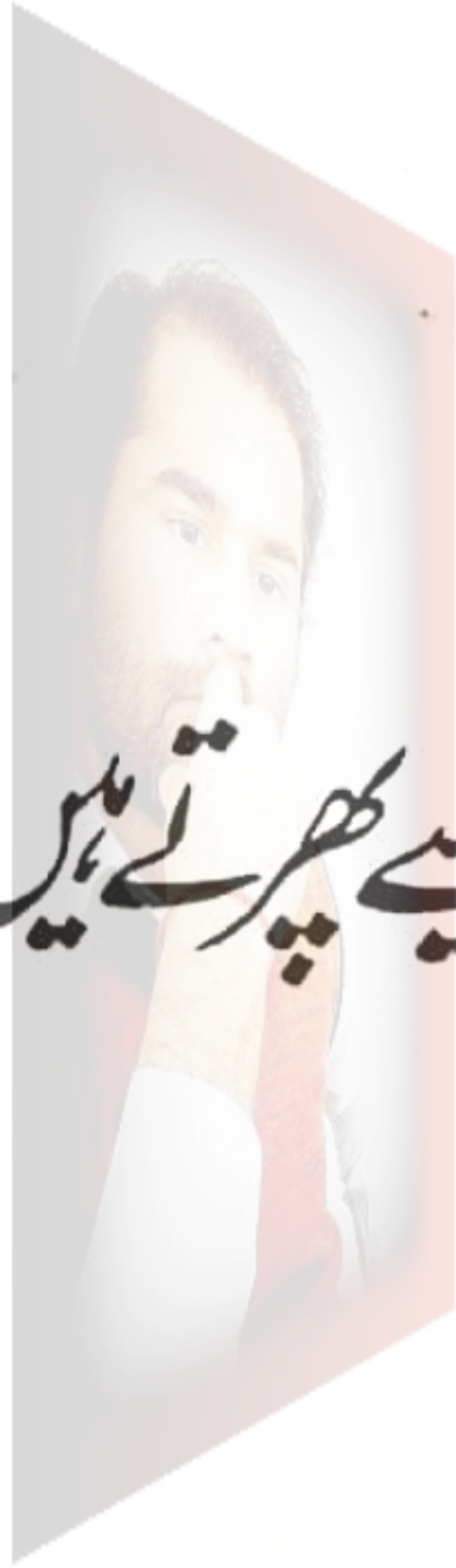
# ہم کہ اک بھیس لیے پھرتے ہیں

کون سے دیس کی بابت پوچھے
وقت کے دشت میں پھرتی
یہ خنک، سرد ہوا
کن زمانوں کی یہ مدفون مہک
بدنما شہر کی گلیوں میں اڑی پھرتی ہے
اور یہ دور تلک پھیلی ہوئی

نیند اور خواب سے بوجھل بوجھل
اعتبار اور یقیں کی منزل
جس کی تائید میں ہر شے ہے
بقا ہے لیکن
اپنے منظر کے اندھیروں سے پرے
ہم خنک، سرد ہوا بن بھی سکیں!
ہم کہ کس دیس کی پہچان میں ہیں
ہم کہ کس لمس کی تائید میں ہیں
ہم کہ کس زعم کی توفیق میں ہیں
ہم کہ اک ضبط مسلسل ہیں
زمانوں کے ابد سے لرزاں
وہم کے گھر کے مکیں
اپنے ہی دیس میں، پردیس لیے پھرتے ہیں
ہم۔ کہ اک بھیس لیے پھرتے ہیں

# موت دل سے لپٹ گئی اس شب

ایک خوابِ ہزیمت دنیا
ایک آہٹ دوامِ خواہش کی
ایک جوڑی قدیم ہاتھوں کی
اور آنکھوں کے بند فرغل میں
ایک خواہش ہمیشہ رہنے کی
ایک بستر، پرانی یادوں کا

اور سویا ہوا دلِ وحشی
آہنی انگلیوں کے پنجے میں
اک گھنی تیرگی کے رستے میں
ذائقہ' بھولی بسری بارش کا
ایک سایہ' جھکا ہوا دل پر
دیر تک آسماں سے گرتی ہوئی
ایک مدھم صدا دریچوں میں
ایک پر شور سیل کی آواز
سانس کی سلوٹیں' ڈبوتی ہوئی!
کون تھا' اس سمے کے آنگن میں
جاگتی رات کو تھپکتا ہوا
کون تھا' رات دن کے پھیرے میں
گئی دنیاؤں سے ابھرتا ہوا
رو رہا تھا دیارِ غربت میں
اور معدوم کے علاقے میں
اپنی آنکھوں میں ڈال کر مٹی
خواب تکتا ہوا میں بچپن کے
ایک ہنستے ہوئے' گزشتہ میں!
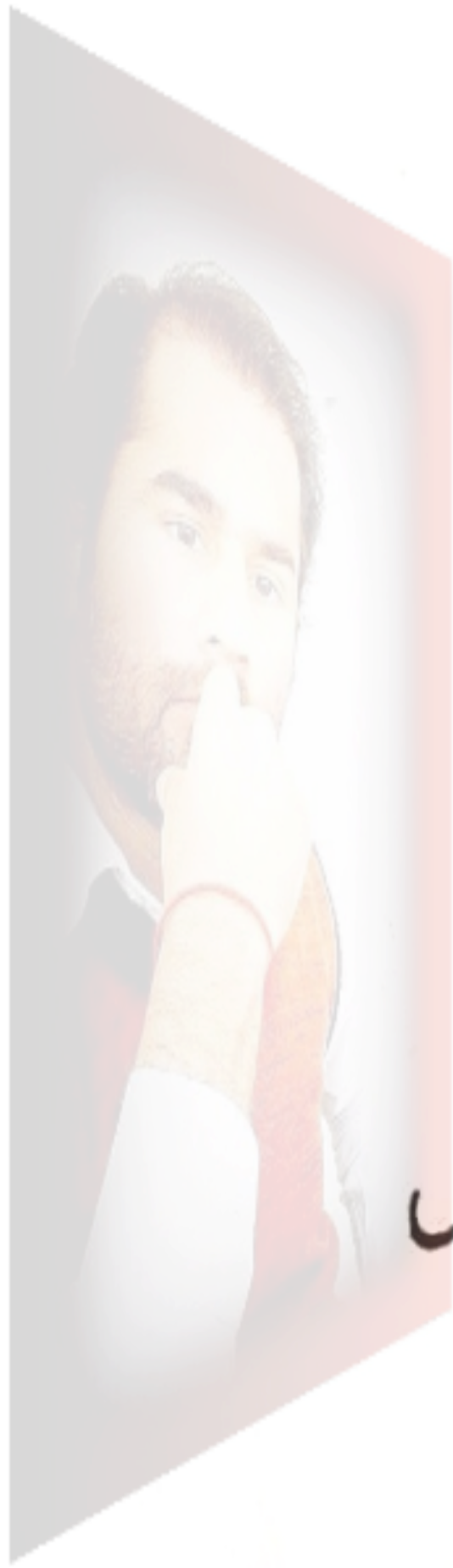
# لوری سُنا

مٹی اب ان قدموں تلے بے چین ہے

لوری سنا

اے ماں ہمیں لوری سنا

---

وہ جو دن بھلے تھے گزر گئے

وہ جو دن کڑے تھے گزر گئے
وہ جو پہلی رت کے گلاب تھے
انہی راستوں میں بکھر گئے
ہمیں بے کلی ہے نہ چین ہے

لوری سنا

یہ وہ شہر خواب و نظر نہ تھا
یہاں خاک میں وہ ہنر نہ تھا
یہاں دل زدوں کا گزر نہ تھا
پس گرد راہ رواں رہے
یونہی دربئے دل و جاں رہے
جو رہے بھی ہم تو کہاں رہے

ترے ناز ہم نے اٹھائے تھے
ترے پھول ہم نے کھلائے تھے
ترے زخم دل سے لگائے تھے
ہمیں اذن رنج سفر تو دے
ہمیں واپسی کا ثمر تو دے
ہمیں اپنی گود میں گھر تو دے
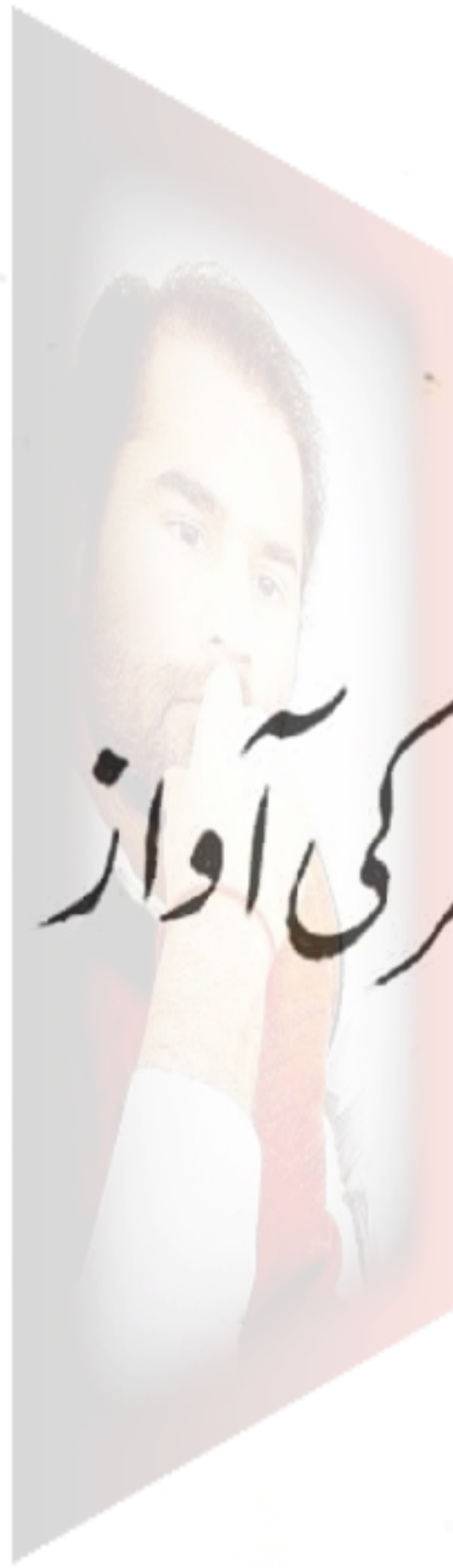
کسی بھولے نام کا ذائقہ
کسی زرد دن کی گرفت میں
کسی کھوئے خواب کا وسوسہ
کسی گہری شب کی سرشت میں
کہیں دھوپ چھاؤں کے درمیاں
کسی اجنبی سے دیار کے

میں، جوار میں پھروں کس طرح؟
یہ ہوا چلے گی تو کب تلک
یہ زمیں رہے گی تو کب تلک
کھلے آنگنوں پہ
مہیب رات، جھکی رہے گی تو کب تلک

یہ جو آہٹوں کا ہراس ہے
اسے اپنے میلے لباس سے
میں، جھٹک کے پھینک دوں کس طرح
وہ جو ماورائے حواس ہے
اسے روز و شب کے حساب سے
کروں بے دماغ میں کس طرح؟
کوئی آنسوؤں کی زباں نہیں
کوئی ماسوائے گماں نہیں
یہ جو دھندلی آنکھوں میں ڈوبتا کوئی نام ہے
یہ کہیں نہیں
یہ کہاں نہیں؟
یہ قیامِ خواب، دوامِ خواب ——
رہوں اس سے دور میں کس طرح

انہی ساحلوں پہ
تڑپتی ریت میں سو رہوں
مجھے اذنِ ذلتِ ہست ہو

# سرپھری ہوا
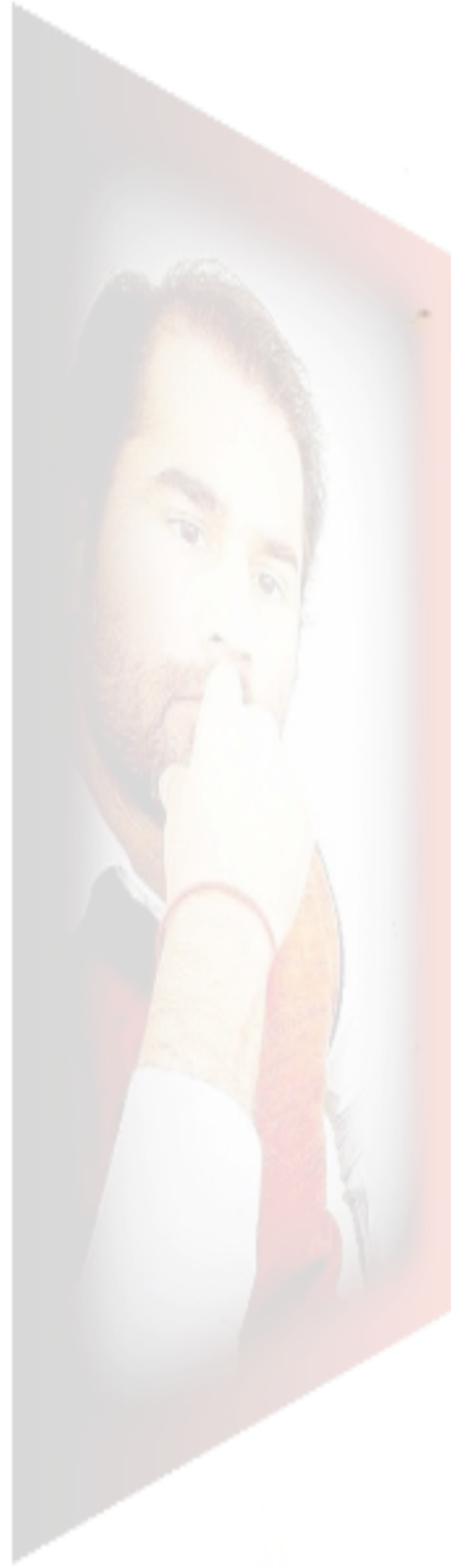
ہے شامِ ابرِ باراں
پردے ہلے دلوں کے
آنکھوں سے چھو کے گزرے
سپنے گئے دنوں کے
بجنے لگے دریچے
انجانی سرخوشی سے

کتنے اڑائے چھینٹے
اس سرپھری ہوا نے
دل میں تری طلب کے
بجنے لگے ترانے
جو دھول جم گئی تھی
وہ دھل گئی ہے آخر
جو بھیڑ میں اچانک
ہونٹوں سے گر گئی تھی
دھن۔ مل گئی ہے آخر!

# مَیں رستے کو دیکھ رہا ہوں

اتنے لوگ ہیں تیری جانب دیکھنے والے
چاندی جیسے چہروں والے
اجلے اجلے خوابوں، میلے کپڑوں والے
صدیوں کے گرداب میں جکڑی چیخوں والے
ڈری ہوئی امیدوں، سہمی سانسوں والے
اچھے دنوں کی آس پہ زندہ

دھندلی آنکھوں پر
ہاتھوں کا سایہ کر کے
تیری جانب دیکھ رہے ہیں
میں رستے کو دیکھ رہا ہوں!
ہیلمٹ والے
اکڑے کوٹوں، تنی ہوئی پتلونوں والے
لمبے دانتوں، لوہے کے دستانوں والے
ننگے ٹخنوں، خوشبودار قمیضوں والے
اپنی کالی خواہش کے کیچڑ میں لت پت
تیری جانب دیکھ رہے ہیں
میں رستے کو دیکھ رہا ہوں
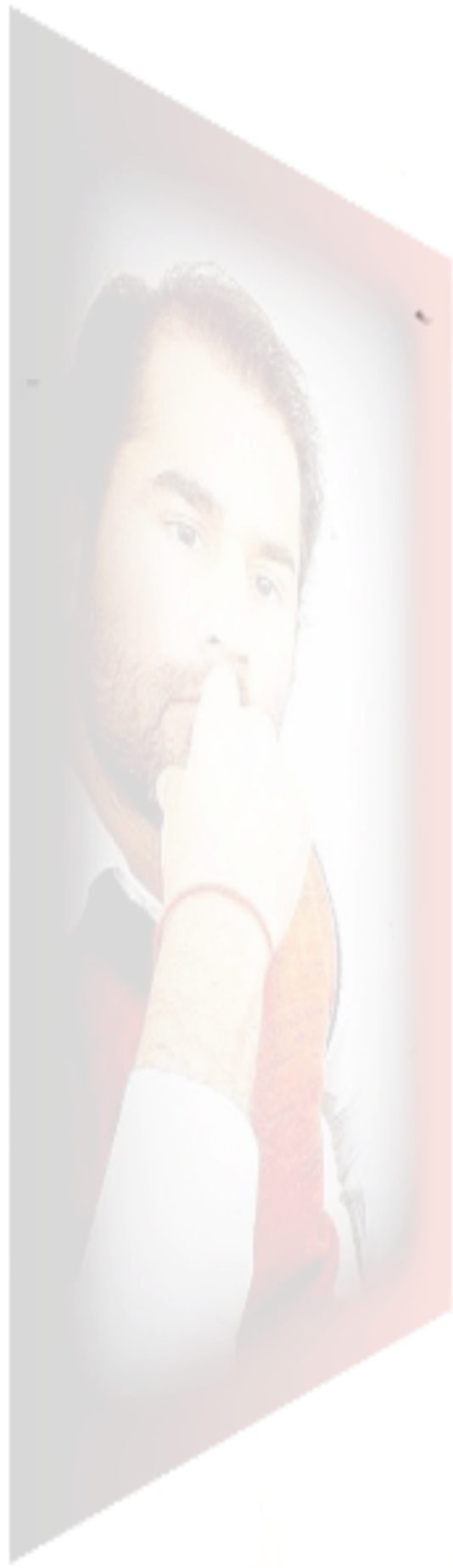


رستہ، جس پر
خوش الحان ربوبیت کا سایہ ہے
رستہ جس پر
سبز عماموں میں ملبوس
اندھیرے کے سوداگر
پتھر بانٹ رہے ہیں

تیری پیشانی کی خاطر
رستہ جس پر
تیرے بڑھتے قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے

ڈرتے' ڈرتے'
میں بھی شاید
تیری جانب دیکھ رہا ہوں

# دوامِ وصل کا خواب



پکی گندم کے خوشوں میں
اڈتے دن کے ڈیروں میں
اندھیرے کی گھنی شاخوں
پرندوں کے بسیروں میں
تھکے بادل سے گرتے نام کے اندر
اترتی شام کے اندر

دوامِ وصل کا اک خواب ہے
جو سانس لیتا ہے
مہکتی سرزمینوں میں
مکانوں میں، مکینوں میں
ترے میرے علاقوں میں
ہمارے عہد ناموں میں
لرزتے بادبانوں میں
کہیں دوری کے گیتوں میں
کہیں قربت کی تانوں میں
ازل سے تا ابد پھیلی ہوئی
اس چادرِ افلاک کے اندر
ردائے خاک کے اندر
ہماری نیند کی گلیوں میں
اپنی دھن بجاتا ہے
مکانِ عافیت کے بند دروازے گراتا ہے
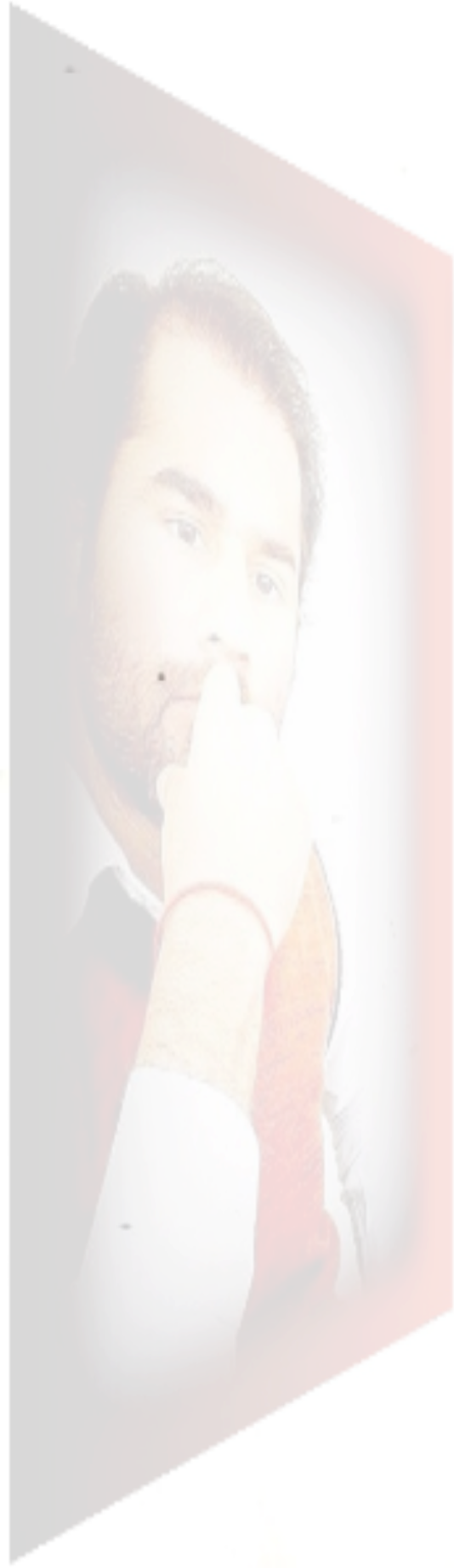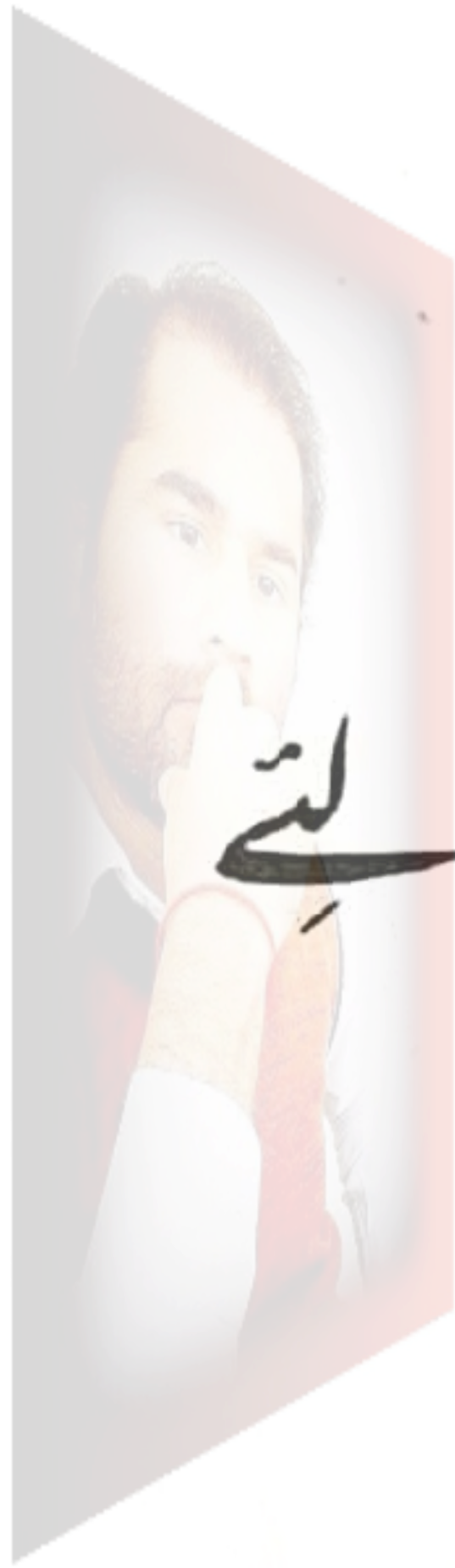
## مجید امجد کے لئے

تم آتے ہو دور دیس سے
دور دیس سے آنے والوں پر
ہر کوئی ہنستا ہے
دل ڈرتا ہے
جب سرد ہوا کے آنچل میں
منہ ڈھانپ پرندے سوتے ہیں

جب شام ڈھلے دیواروں پر
کچھ سائے گڈمڈ ہوتے ہیں
کچھ شکلیں رنگ جماتی ہیں
اجڑی اجڑی دہلیزوں پر
خاموشی دستک دیتی ہے
اور بند کواڑوں کی تنہائی
ہر سو' خاک اڑاتی ہے
اس لمحے کوئی
دل میں کروٹ لیتا ہے
جب وقت کے کاہل ماتھے پر
ناموں کی بوندیں گرتی ہیں
مٹی میں خوشبو گھولتی ہیں
ہر پھول کے دل میں
آتی رت کا دھڑکا جاگنے لگتا ہے
تب دھیان میں جانے کس بستی سے
دھیمے دھیمے قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے
تم۔ آتے ہو؟

تم آؤ گے؟

دل ڈرتا ہے
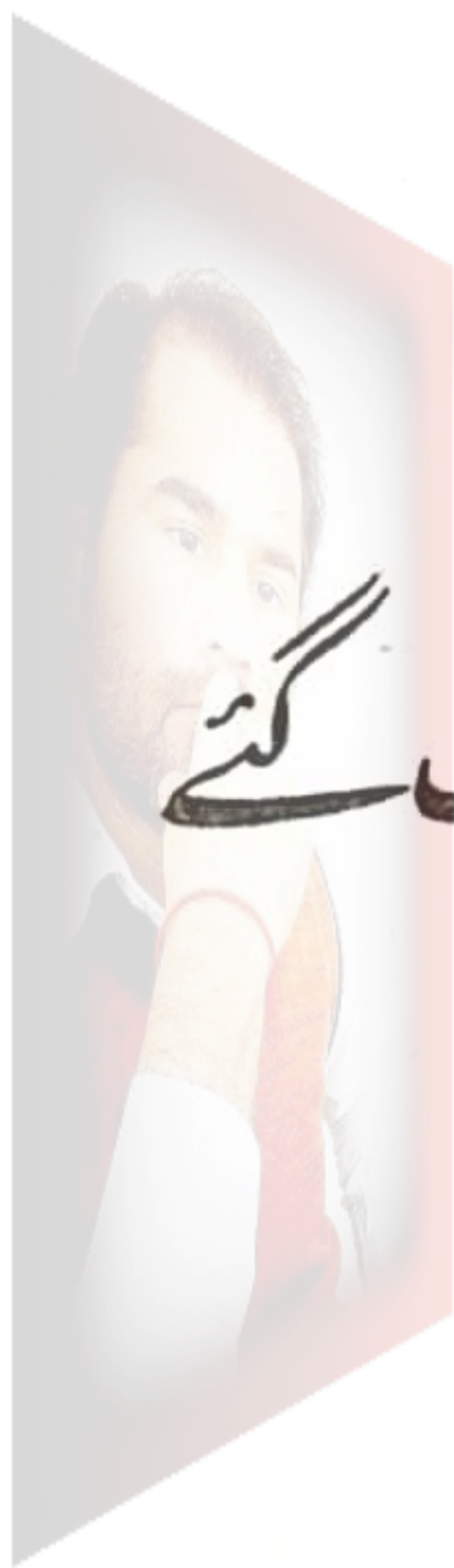
# تم کہاں تک گئے

اپنے قدموں کے نیچے
پھسلتے ہوئے راستوں
فاصلوں سے الجھتے ہوئے
آنکھ کی سرحدوں پر درختوں کے جھنڈ ——
غیر آبادیوں سے پرے
وادیوں سے پرے

دھند کے نرم ہاتھوں میں ٹھٹھرے ہوئے

آسماں سے پرے

تم کہاں تک گئے ——؟

خواہشوں سے پرے

نیلی پیلی رگوں کی گرہ کاٹ کر

بھوک سے، پیاس سے

آنسوؤں سے پرے؟

لحظہ لحظہ بدلتی ہوئی رت کی بوچھار میں بھیگ کر

جسم کی ذلتوں

خواب کی لذتوں

ریشمی نیند، بیمار بیداریوں سے پرے

دن کے میلے پسینے کو

ماتھے سے دھوتے ہوئے

تم کہاں تک گئے ——؟

خواب کی نرم ساعت —— تمہارے لیے

وقت کے سارے تیور

حزیں، مضمحل

"نیند کی مار کھائے ہوئے"

روز و شب کی اذیّت میں اترے ہوئے
یہ غصیلے ہجوم ——
اس زمیں سے پرے
اس یقیں سے پرے ——؟
اس حصارِ زمان و مکاں کی حدوں تک
تو —— ہم بھی گئے
تم —— کہاں تک گئے ——؟
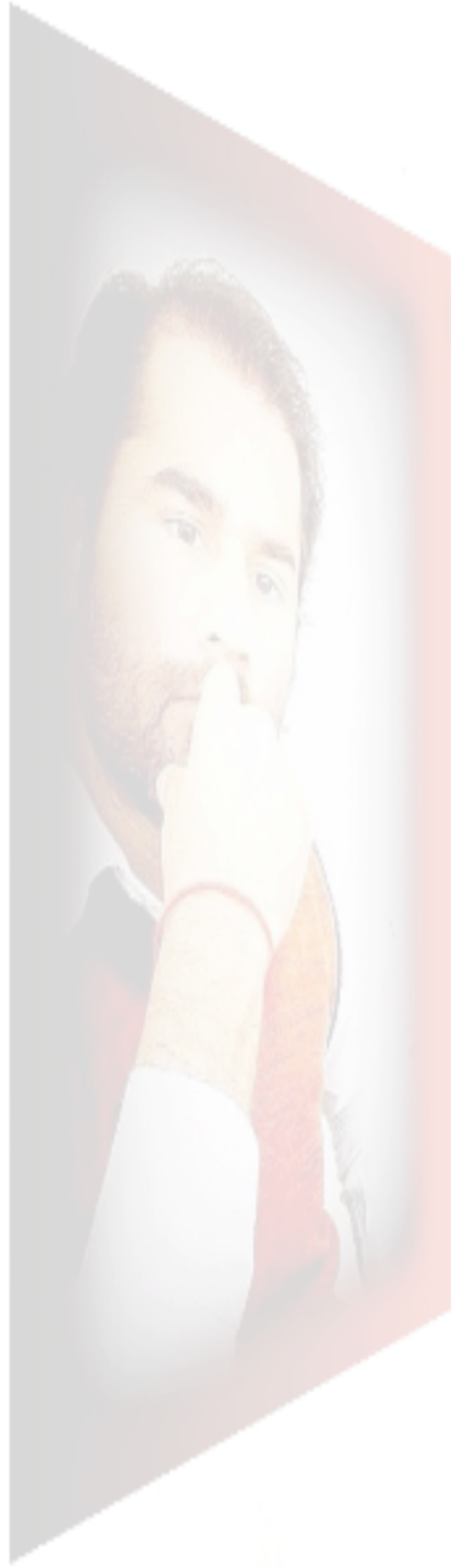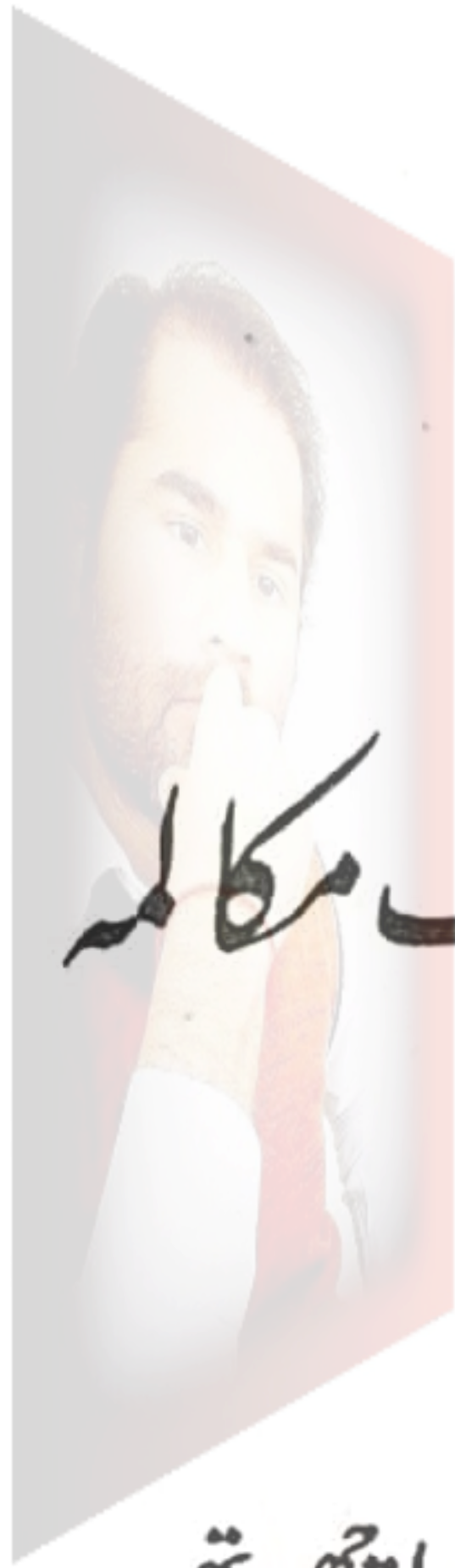
# مٹی سے ایک مکالمہ

ماں کہتی ہے

"جب تم چھوٹے تھے تو ایسے اچھے تھے

سب آباد گھروں کی مائیں

پیشانی پر بوسہ دینے آتی تھیں

اور تمھارے جیسے بیٹوں کی خواہش سے

ان کی گودیں، بھری رہا کرتی تھیں ہمیشہ

اور میں تمہارے ہونے کی راحت کے
نشے میں
کتنی عمریں چُور رہی تھی ——"

اک اک لفظ مرے سینے میں اٹکا ہے
سب کچھ یاد ہے —— آج
کہ میں اک عمر نگل کر بیٹھا ہوں
عمر کی آخری سرحد کی بنجر مٹی
جب سے ماں کے ہونٹوں سے گرتے لفظوں میں
کانپتی ہے
میری سانس تڑپ اٹھتی ہے
اس کے مٹتے نقش مرے اندر
کہرام سی اک تصویر بنے ہیں
زندگیوں کے کھوکھلے پن پر
آنسووں لپٹی، ہنسی مرے ہونٹوں پہ لرزتی رہتی ہے
اچھی ماں ——!
عمر کے چلتے سائے کی تذلیل میں
تیرے لہو کے رس کی لذت
تیرے غرور کی ساری شکلیں

ان رستوں میں، مٹی مٹی کر آیا ہوں
پتھریلی سڑکوں پہ اپنے ہی قدموں سے
خود کو روند کے گزرا ہوں
میرے لہو کے شور میں تیری
کوئی بھی پہچان نہیں ہے
تیری اجلی شبیہ، کچھ ایسے دھندلائی ہے
تجھ سے وصل کی آنکھ سے
بینائی زائل ہے
میں تیرے دردوں کا مارا
تیری ہی صورت، میں بھی
اک جیون ہارا
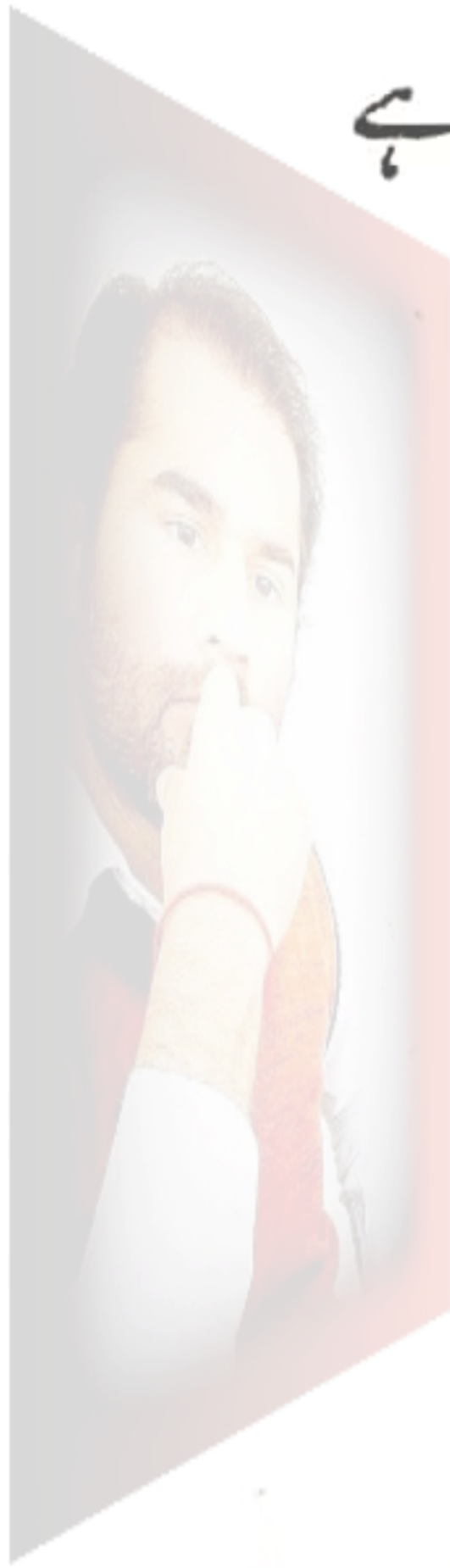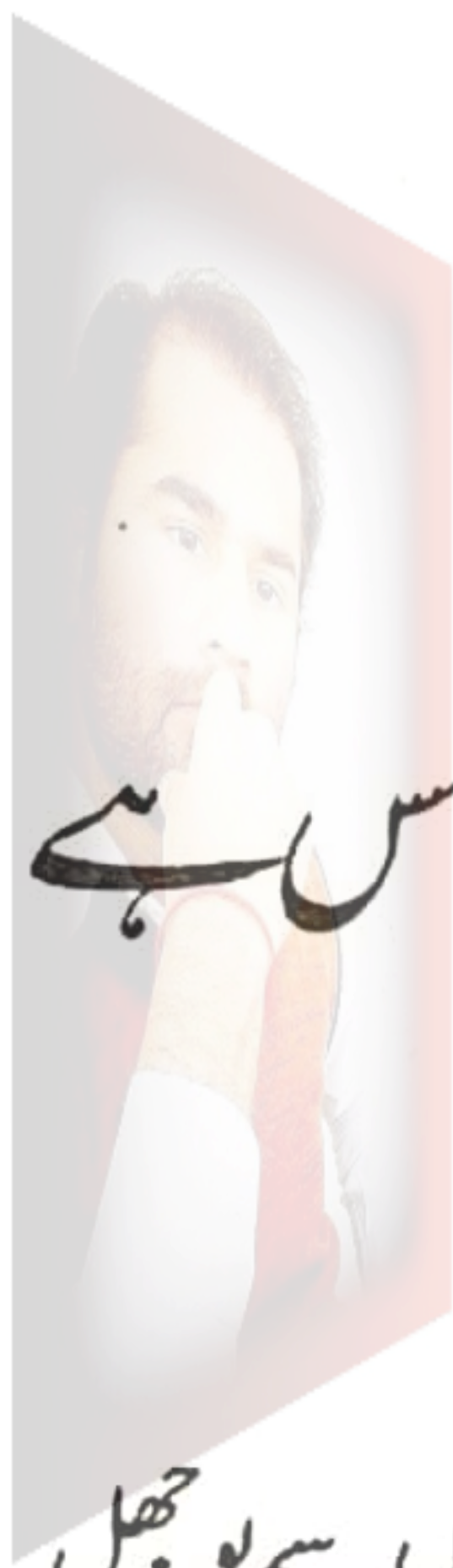
# جو بھی لمس ہے

نیند کا دن سے ربط عجب ہے
پلکیں خواب کے ان جانے لفظوں سے بوجھل
دھوپ کی چادر میں لوگوں کی جلتی آنکھیں
شورِ جہاں میں ڈوبتی جاتی آہٹ دل کی
پیاس کی زد پر سارے لمحے
اپنی آنکھیں موند کے دیکھو

نیند کی ٹھنڈی خنک ہوائیں
چلتے بولتے سانسیں لیتے
زندہ سایے
دن کے کاہل ماتھے کو ہاتھوں سے چھو کر
بادل کی رفتار ہوئے
ہر دل میں بیدار ہوئے
جو بھی لمس ہے
زندہ ہے۔ نیندوں کے اندر
بھیگی بھیگی راتوں کی گدلائی چپ میں
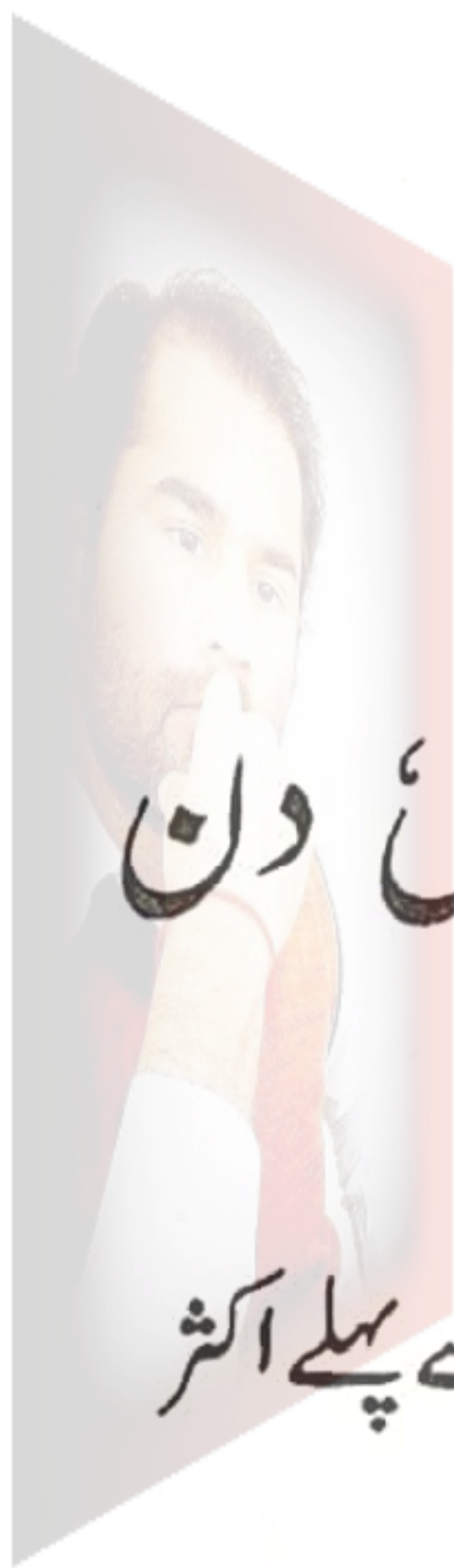
# خوابٔ شبیہیں دن

دن کے بوجھل ہاتھ کے دل پر پڑ جانے سے پہلے اکثر
خوابوں کی بیمار شبیہیں
دور دور تک آنکھوں کے میدانوں میں
بھیگتے پیڑوں کے گیتوں کا لمس بنیں

نیند کی ٹھنڈی برف ردائیں

اپنی آنکھیں میچ کے
ان دنیاؤں کی تصویر اجالی ہے میں نے
جن کی دھن میں میرا دل
جانے ' انجانے
دیکھے ' ان دیکھے رستوں پر
قطرہ قطرہ ٹپک گیا تھا
میں نے اپنی سانسیں تھام کے پوچھا۔ ہے ان عمروں سے
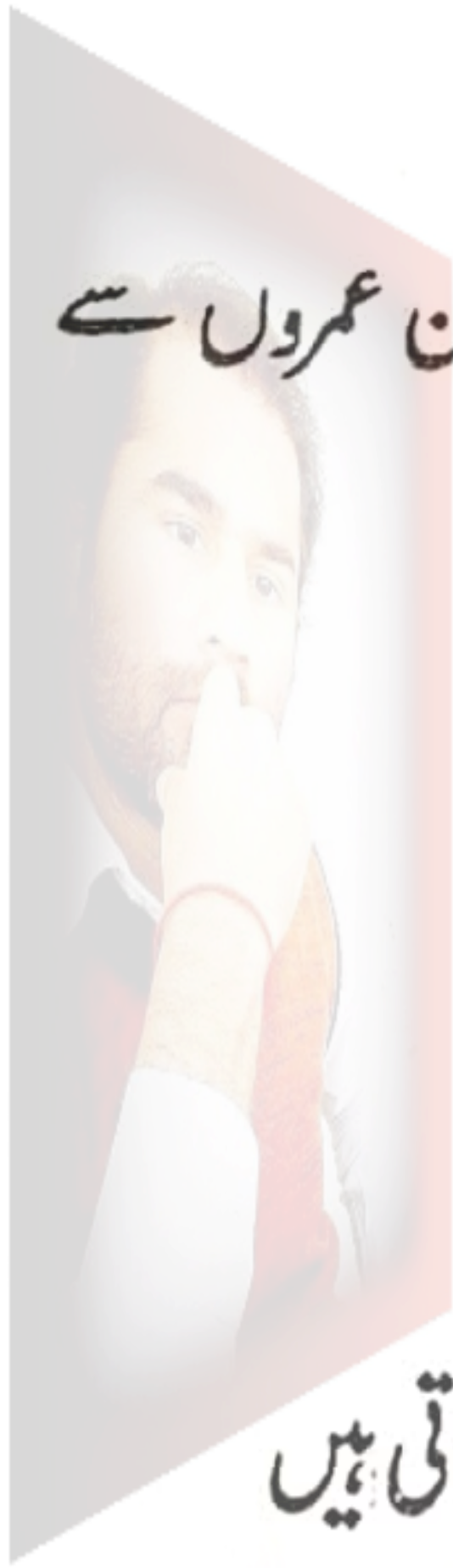


خوابوں کی بیمار شبیہیں
رات کی میلی چادر میں
نیند بھری آنکھوں میں جاگ کے
کن دنیاؤں ' کن رستوں کے نام بسا کر
کیسے دن کے پیلے میدانوں میں اوجھل ہو جاتی ہیں
دھوپ کی قیدی ہو جاتی ہیں

## موجود سے پرے

کتنی باتیں ہیں لبھانے والی
ناشتہ' دودھ'
نئے دن کا پرانا اخبار'
دوشِ امروز پہ ماضی کا غبار'
خوابِ آسودگی
آوارہ خرامی دل کی

میلے کپڑوں میں گئی رات کا گدلا پانی
اور باہنوں میں مچلتی ہوئی
بیدار ہنسی
اجلے دالان میں
قدموں سے لپٹتی ہوئی خوش پوش ہوا
اور آنکھوں پہ کوئی ہونٹ
نئے لمس کی آسائش میں'
یاد کے رخ پہ
اڈے ہوئے موجود کے بادل کی ردا
اور متروک علاقوں میں کہیں
ایک آواز ـــــــ
فراموش زمانوں میں اترتی ہوئی
دم توڑتی' بیکار صدا
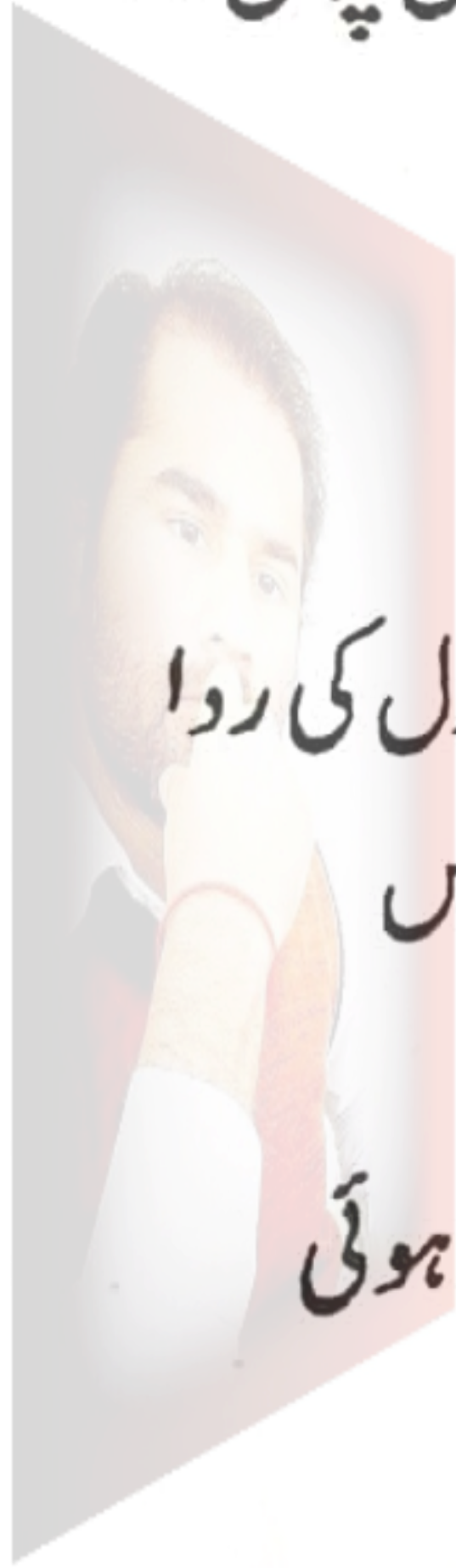
# برسوں بعد

آنکھوں میں آ رکا ہے
اک خواب بے وطن سا
آنگن میں چاند اترا
بیتی ہوئی شبوں کا
دل میں دھک اٹھا ہے
سویا شرر لہو کا

تو ہم کو مل گیا ہے  
اس بے اماں نگر میں  
جوں، امن کا جزیرہ  
سیلابِ شور و شر میں  
اک گوشۂ تسلی  
نفرت کے بام و در میں  
اک فرصتِ نظر ہے  
جو ہم کو ہے میسر  
تو ہے تو ہم کو تھوڑی  
راحت بھی ہے میسر  
کچھ پھول کھل اٹھے ہیں  
اس سونی رہگزر میں  
کچھ دن گزر سکیں گے  
اسبابِ چشمِ تر میں  
یہ کب رہا تھا ممکن  
اس نیند کے سفر میں!
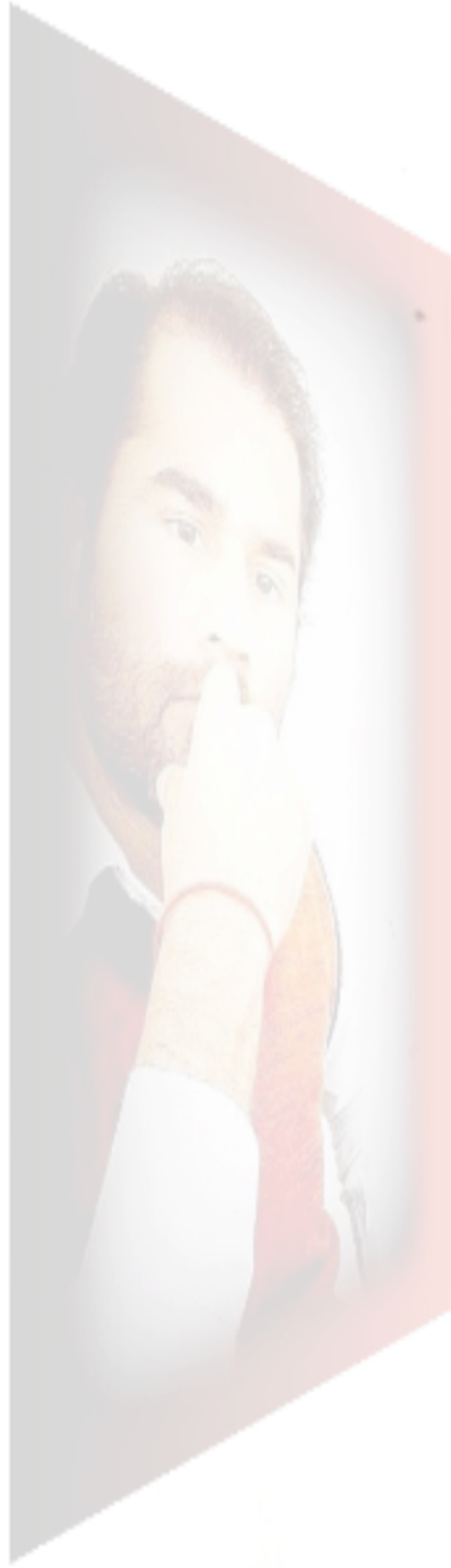
# زندہ آدمی سے کلام

کبھی وقت کی سانس میں
ہونٹ الجھا کے دیکھے ہیں تم نے ——؟
کہ اس بدگماں موسموں کے مغنی کی تانیں
نہاں خانۂ دل میں
گھری خموشی کی ہیبت گراتی چلی جا رہی ہیں
ازل سے ابد تک بچھڑتے ہوئے

سیلِ بے مائیگی میں کبھی
دل اکھڑتے ہوئے، شہر گرتے ہوئے
دیکھ پائے ہو ـــــ تم ـــــ؟
کبھی بھیگے بھیگے سے دیوار و در میں
کہ بچپن کی گلیوں، مکانوں میں
بارش کی آواز سے دل دہلتے ہوئے
کسی مشترک خوف کی آہٹوں سے
دھڑکتے ہوئے، بام و در اور زینے
مسلسل ہوا اور بارش کی آواز چلتی ہوئی
کبھی ـــــ منہ اندھیرے کی تقدیس میں
دور سے آتی گاڑی کی سیٹی کو سنتے ہوئے
تم نے سوچا ہے ان کے لیے
جن کے قدموں میں ـــــ منزل
مسلسل عذاب، اور خوابوں سے تعبیر تک دور ہے
کبھی شام کی سنسناتی ہوائیں
ٹھٹھرتی خموشی کی سہمی صدا اس کے
دروازہ کھولا ہے ان کے لیے
جن کے ہاتھوں کی لرزش میں دستک نہیں
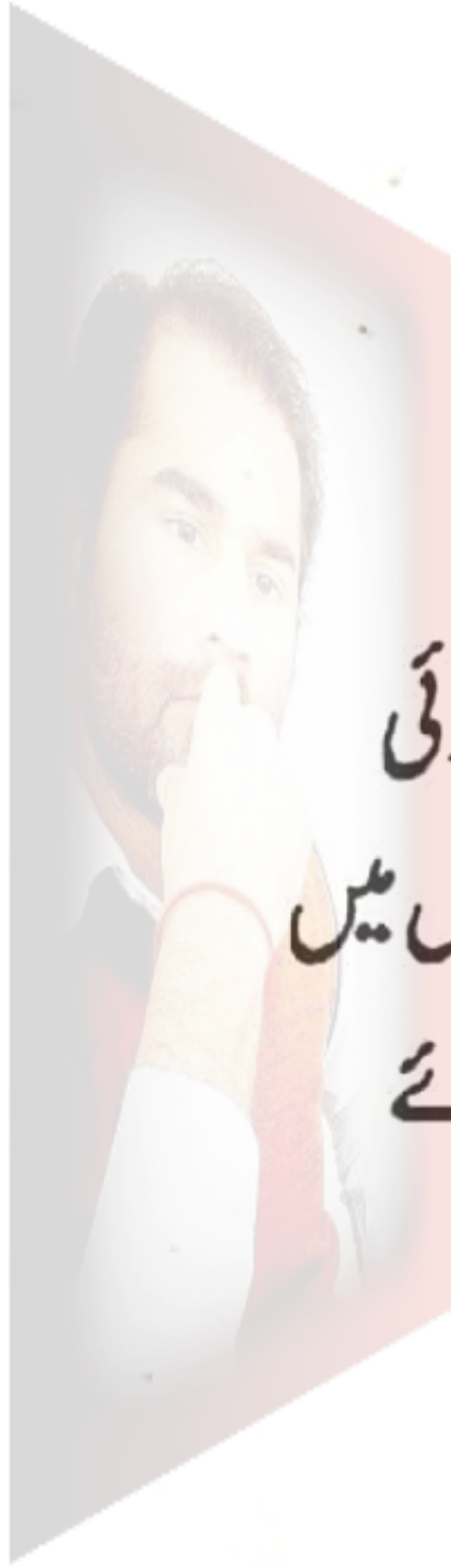
مجھے پوچھنا ہے ——

کہ کھلتے ہوئے پھول، چلتی ہوا

اور گزرے مہ و سال کی دستکوں پر

نہ ہو سکنے والوں پہ آنسو بہائے ہیں تم نے

کہ میں

رات کی ایک ہچکی میں ٹھہری ہوئی سانس ہوں

اور تمہاری گھنی نیند کے بازوؤں سے

پھسلتا ہوا لمس ہوں

# کتنے بیکار ہیں دن

کتنے بیکار ہیں دن
دل میں وہ لہر مچلتی ہی نہیں
جس کی منہ زور کھلی بانہوں میں
خوش نما پھول بہا کرتے تھے
آنکھ کی جھیل میں
اک چاند کھلا رہتا تھا

اب وہ موسم ہی نہیں
جس کی تھکی راہوں میں
ہم نے قدموں کے نشاں چھوڑے تھے
اب کوئی پھول کہیں کھلتا نہیں
کتنے دکھ، خواب کے دروازے پر
اپنا کشکول لیے بیٹھے ہیں
اور یہ ہاتھ، کہ ہلتا ہی نہیں
رات۔ اندیشۂ پیہم لے کر
پھول سے چہروں پہ گرتی ہی چلی جاتی ہے
اور یہ دل، کہ مہکتا ہی نہیں
پاؤں توڑے ہوئے
گھر بیٹھ گیا ہوں، جیسے
اپنی اس قبر سے باہر
کوئی دنیا ہی نہیں
جیسے اس وہمِ خوش اندام کے آنچل کے سوا
میرے سر پر کوئی سایہ ہی نہیں!
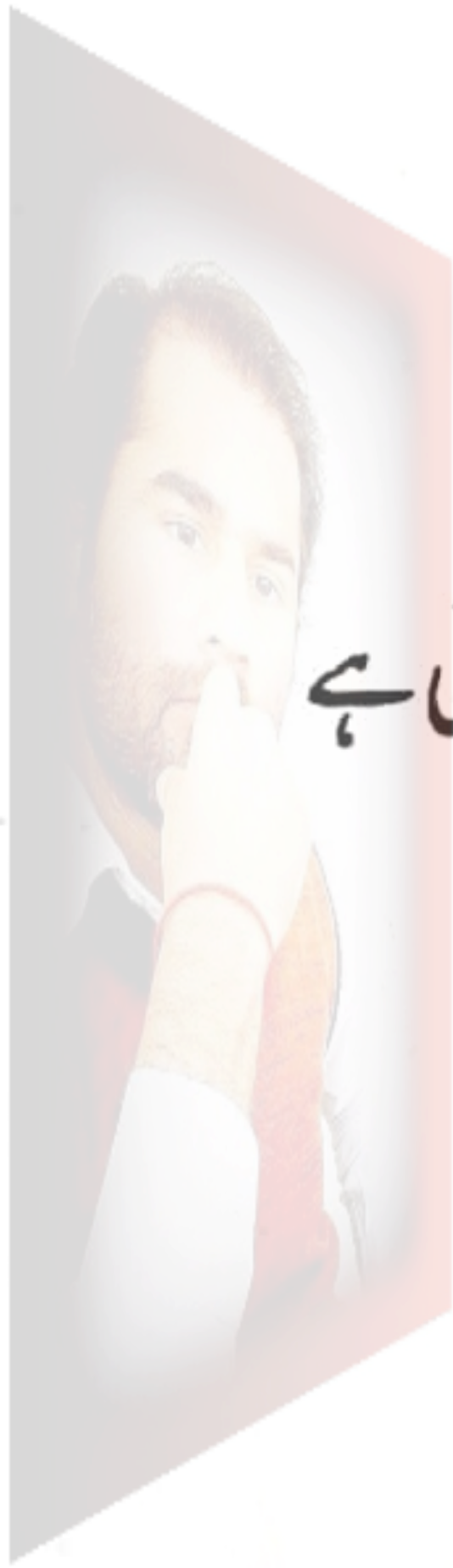
# اکتائے ہوئے دوست سے

بہت ہی دور سے آواز آتی تھی تری جیسے
کوئی اکتائے لہجے میں
مری تنہائیوں پر
میرے روز و شب کی یکساں ذلتوں
پسماندگی کے زہر میں لپٹی ہوئی
اس ذات کی ہمسائگی پر

ہنس رہا ہو۔ دیر تک
اور دور تک ——!
یہاں پر لوگ رہتے ہیں
ترے جیسے، مرے جیسے
اداسی اور معذوری کی ذلت میں
ہنسی کی رُت میں
آسایش کے صحنوں میں
بدلتے موسموں کے ساتھ
اک رقص بہاراں، تیز ہوتا ہے
مگر اس رقص کا حصہ نہیں ہوں میں
نہیں ہے تو
مجھے بھی خاک یہ، اپنی نہیں لگتی
مگر میں دیکھتا ہوں تیری جانب
اور جی اٹھتا ہوں
تیرے لمس کے نشّے میں گہرے خواب بنتا ہوں
مگر یہ بھول جاتا ہوں
ترے اجلے نئے کپڑوں پہ
میرے نام کا دھبّا ترے جی کو جلاتا ہے

ترے دل میں
مری پاگل رفاقت شور کرتی ہے
کہ تجھ کو یاد آتا ہے
کسی تیرے ہی موسم کی نمی سے۔ تر' زمانہ
جس کے منظر میں نہیں ہوں میں
مگر میں کیا کروں
افلاک کے نیچے' کوئی جابر نہیں ہوں میں
کوئی جادو نہیں ہے پاس میرے
یہ منظر' کس طرح تبدیل کر دوں؟
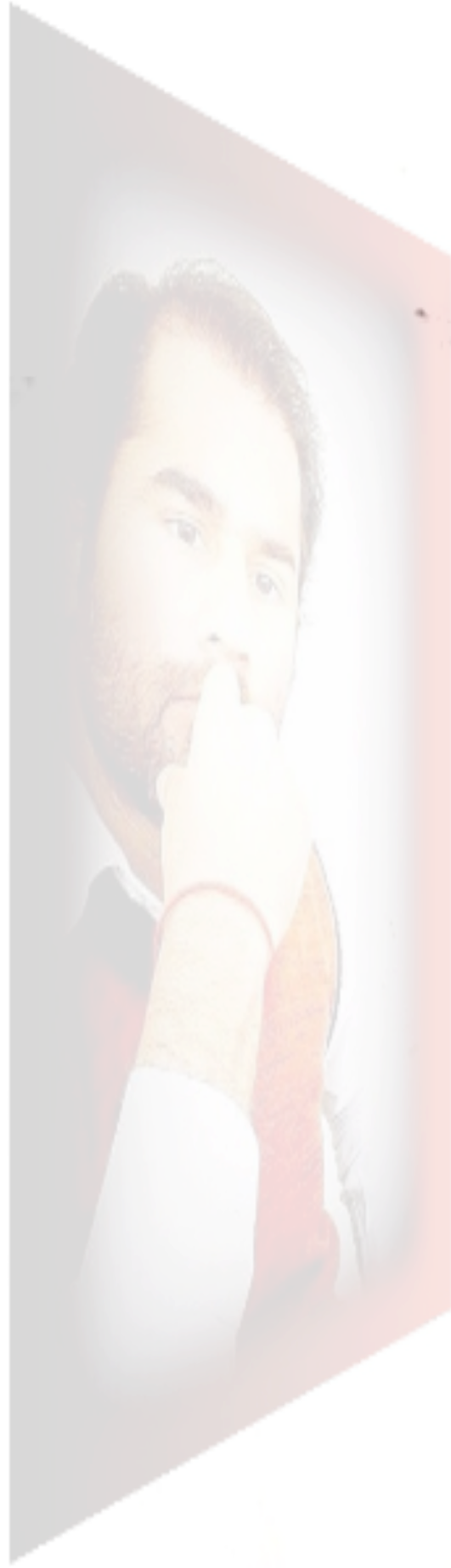
# سمندر سے مکالمہ

دور سمندر

دور بہت ہی دور

دوری کا سنگیت ہوائیں

اس کے عمق کی میت ہوائیں

چپ بستی کا گیت، ہوائیں

گھرے رستے ''سیت'' ہوائیں

اور تھکن سے چور، سمندر

دور بہت ہی دور

۲

تیرے نم کی باس سمندر

تیرے نم کی باس

تو بادل کی پوروں میں چلنے والا اک جوگ

تیرا سایہ، نقش اڑاتا

چہروں کا سنجوگ

تجھ سے چاہت رکھنے والے

سدا منائیں سوگ

تیرے ہونٹوں سے چپکی ہے

کن صدیوں کی پیاس، سمندر

تیرے نم کی باس، سمندر

تیرے نم کی باس

۳

دوری کا ہر بھید سمندر
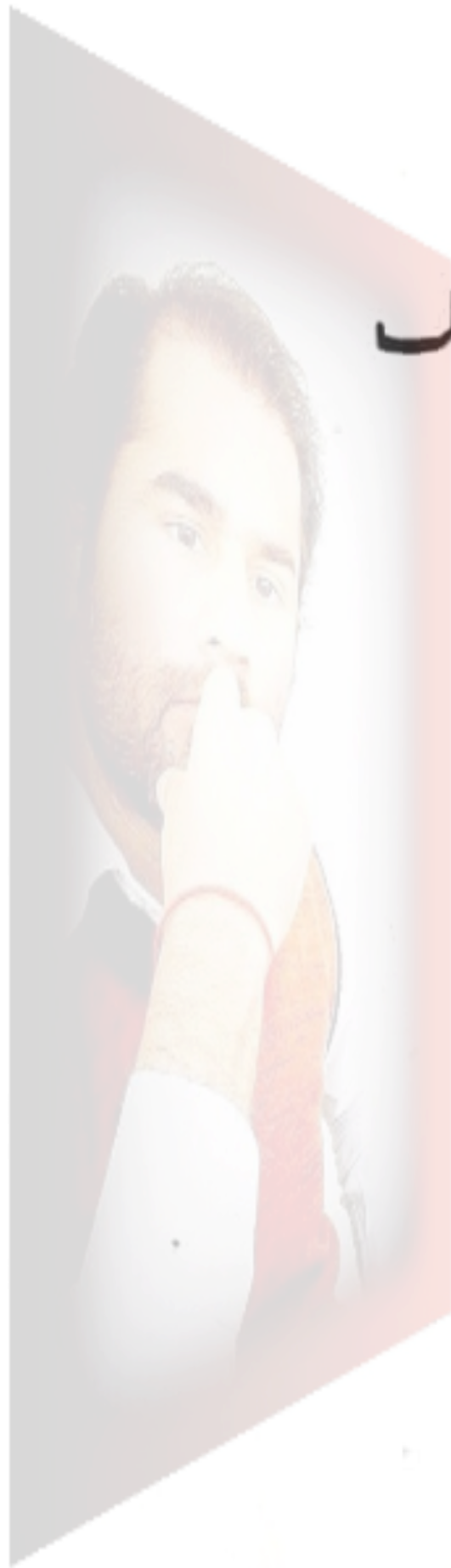
ہم کو تجھ سے پیار
تیری لہر پہ بہنے والی
آنکھیں اتریں پار
سانسیں پی کر، جسم اگل دے
تجھ میں سب سنسار
ہم ہیں جیون ہار، سمندر
ہم ہیں جیون ہار





۳

بھولی بسری یاد سمندر
بھولی بسری یاد
تیرے نم کے گیت سے دوری، ابد میں چلتی جائے
تجھ سے پیار بڑھا کر اس جیون کی کتھا پچھتائے
تیری کھوج میں نکلے دل کو کیسے کوئی سمجھائے
سانسیں دھول میں لت پت
آنکھیں، مٹی میں آباد۔ سمندر
بھولی بسری یاد

# کیسے اُتروں پار

میں نے تیرے ساتھ سمندر پار کیا
کٹھن دنوں کا
خوابوں اور آوازوں کا
اور انجان جزیروں کی تنہا راتوں کا
موت کی کالی لہروں سے بچ کر نکلا ہوں
تیرے ہاتھوں کی کشتی میں

اور اب تیرے بدن سے گرتی
بوندوں کی مہکار میں سویا رہتا ہوں
ساحل، یاد
اندھیرے کی نم ناک پھوار
ٹھنڈی ریت پہ گرے پڑے ہیں
تیری سانسوں کے پتوار
اور اب یہ ـــــ اک اور سمندر
کدھر گئے ترے ہاتھ ـــــ؟
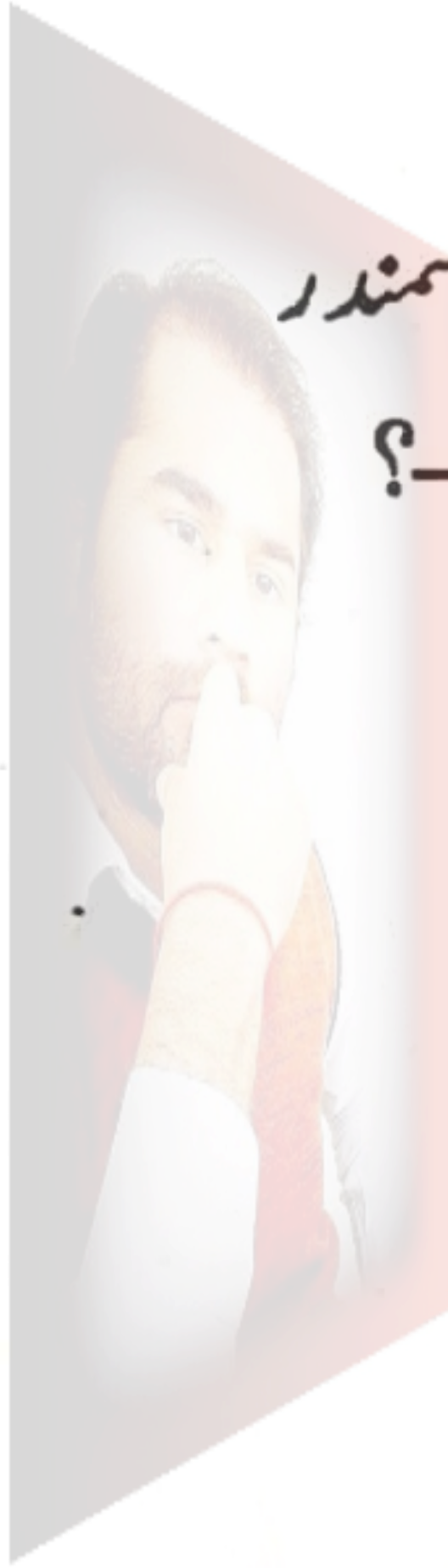
# پچھلے پہر کی دستک

ترے شہر کی سرد گلیوں کی آہٹ
مرے خون میں سرسرائی
میں چونکا
یہاں کون ہے
میں پکارا، مگر
دور خالی سڑک پر کہیں

## رات کے ڈوبتے پہر کی خامشی چل پڑی

رت جگوں کی تھکاوٹ میں ڈوبی ہوئی
آنکھ سے۔ خواب نکلا کوئی
لڑکھڑاتا ہوا
رات کے سرد آنگن میں گرتا ہوا
خالی شاخوں میں اٹکے ہوئے
چاند کی آنکھ سے ایک آنسو گرا
اور سینے میں گم ہوگیا
دھند کی نرم پوریں
مساموں میں چلنے لگیں
دو طرف ایستادہ درختوں کے نیچے
بہے آنسوؤں کی مہک میں مجھے
نیند آنے لگی
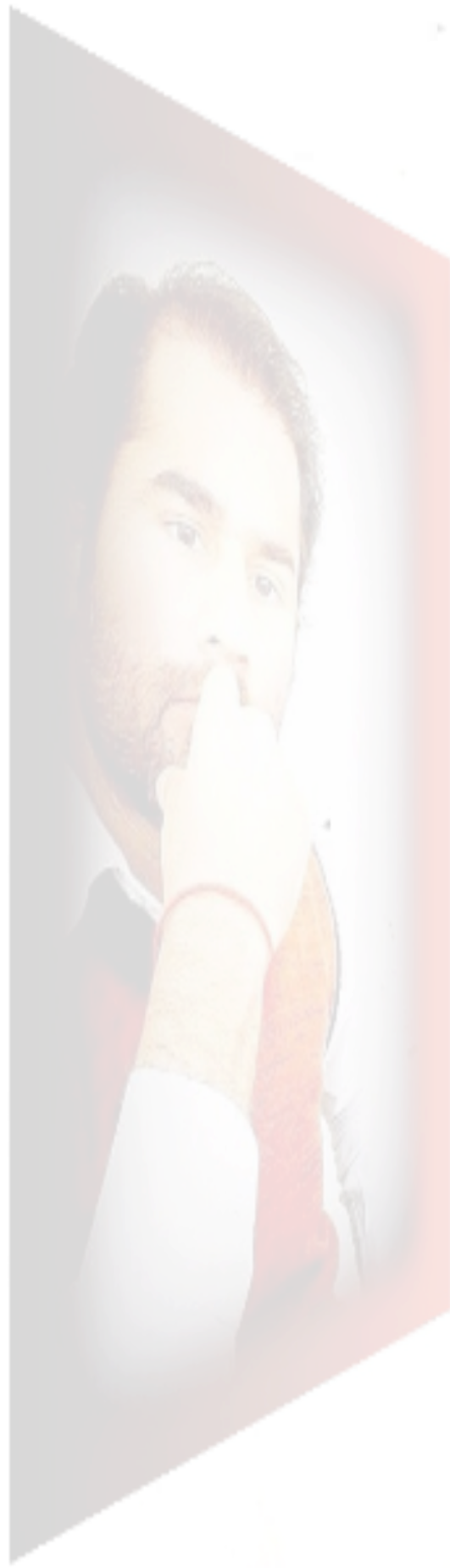
اجنبی کون ہو
کن زمینوں' زمانوں سے چلتے ہوئے
کیسی بستی کی خوشبو لپیٹے ہوئے
میرے دل کے نگر میں قدم رکھ رہے ہو
تمہارے خدوخال پر' کس لیے
اجنبیت کی مانوسیت

گہری، اندھی مسافت کی دھول
اور لاحاصلی کی تھکاوٹ جمی ہے ——

کوئی ان دیکھی، ان جانی آواز
بے انت دوری، ہواؤں کی بے راگنی سے الجھتی ہوئی
جب سماعت میں
سرگوشیاں بن کے گرتی ہے
یہ دل سنبھلتا نہیں
یہ جو عمروں کی گنتی ہے
اس کے عدد بھول جاتے ہیں
کچھ یاد رہتا نہیں
یہ جو دل کے سمندر میں
کھولے ہوئے بادباں دیکھتے ہو
یہ ٹکڑے ہیں بیتی ہوئی ساعتوں کے
اسی ساحلِ بے اماں پر
پھسلتی ہوئی ریت پر نام ہیں
جن کے حرفوں میں
میری طنابیں گڑی ہیں
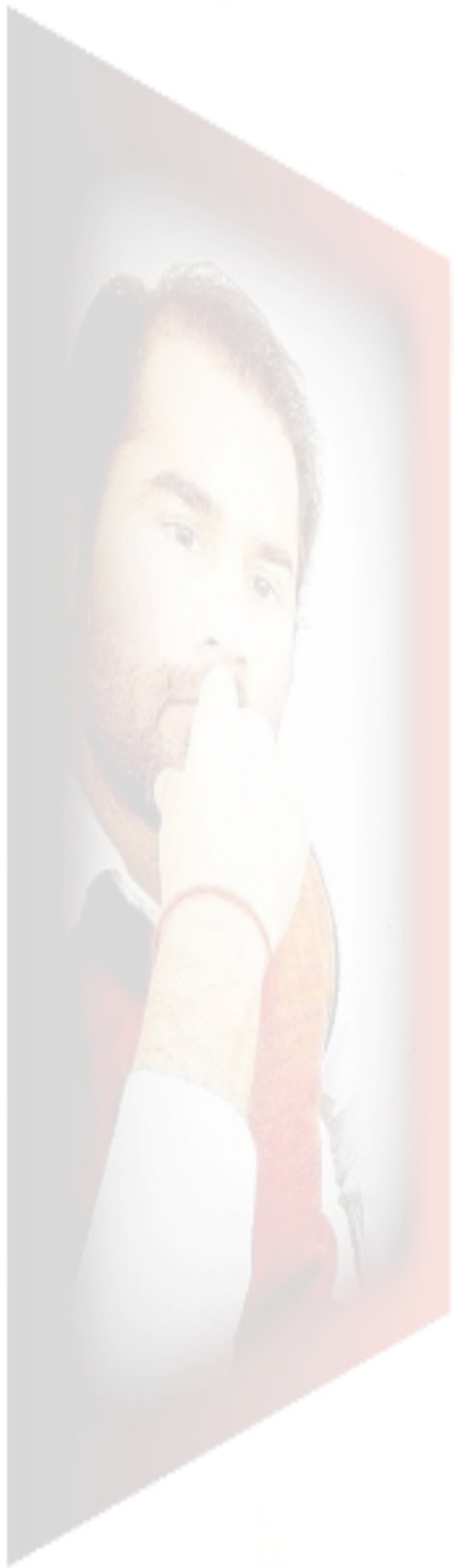
یہیں چار سو
اک گھنیری خموشی میں سہما ہوا
دل کا میداں ہے جس پر
گرجتا ہوا ابر چھایا ہوا ہے
برستا نہیں ہے
اندھیرے کی چادر افق تا افق چھاؤں ہے
دوریاں بھی تو اک خواب ہیں' تیری میری طرح
اور پھر کونسی ایسی آہٹ ہے جس سے
در و بام دل کے دھڑکنے لگیں
واہمے کے سوا
تم بھی شاید کوئی واہمہ ہو
ہر اک واہمے کی طرح!

# ہوا جب تیز چلتی ہے

ہوا جب تیز چلتی ہے
شکستہ خواب جب ٹھیالے رستوں پر
مرا دامن پکڑتے ہیں
جھکی شاخوں کے ہونٹوں پر
کسی بھولے ہوئے نغمے کی تانیں
جب الٹتی ہیں

گزشتہ وہم کی آنکھیں، مرے سینے میں گرتی ہیں
ستارے جب لرزتے ہیں
مری آنکھوں کی سرحد پر
افق، دھندلانے لگتا ہے
مہک آتے دنوں کی پھیل جاتی ہے
مشام جاں میں اک منہ زور خواہش
موت بن کر۔ جاگتی ہے جب
گزشتہ وہم کی آنکھیں مرے سینے میں گرتی ہیں
گلے جب وقت ملتے ہیں
ترے میرے زمانوں کے پرندے
اڑنے لگتے ہیں
سحر جب دھیمی دستکوں میں
نیند کی جھولی میں گرتی ہے
میں تیرے ہاتھ
خوابوں کے پھسلتے لمس پر محسوس کرتا ہوں
ترے ہونٹوں کی لرزش
مجھ سے رخصت میں لپٹتی ہے
میں تجھ کو دیکھ سکتا ہوں ——
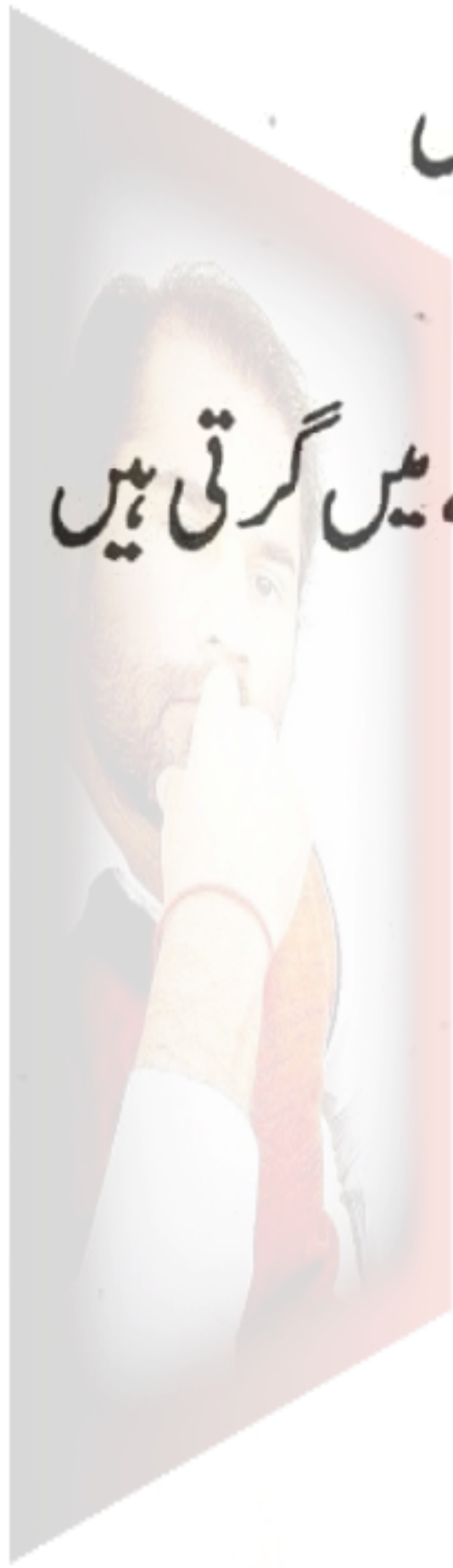
مجھے پھر مل سکے گا واہمہ ؟

جس قید میں آ کر

مری عمریں سنورتی ہیں

وہ موسم جس میں تیرے نام کی خوشبو

مری سانسیں بھگوتی ہے

وہی اک شام

جس آنچل میں میرا دل دھڑکتا ہے

وہی اک زندگی جس میں

گزشتہ وہم کی آنکھیں مرے سینے میں گرتی ہیں
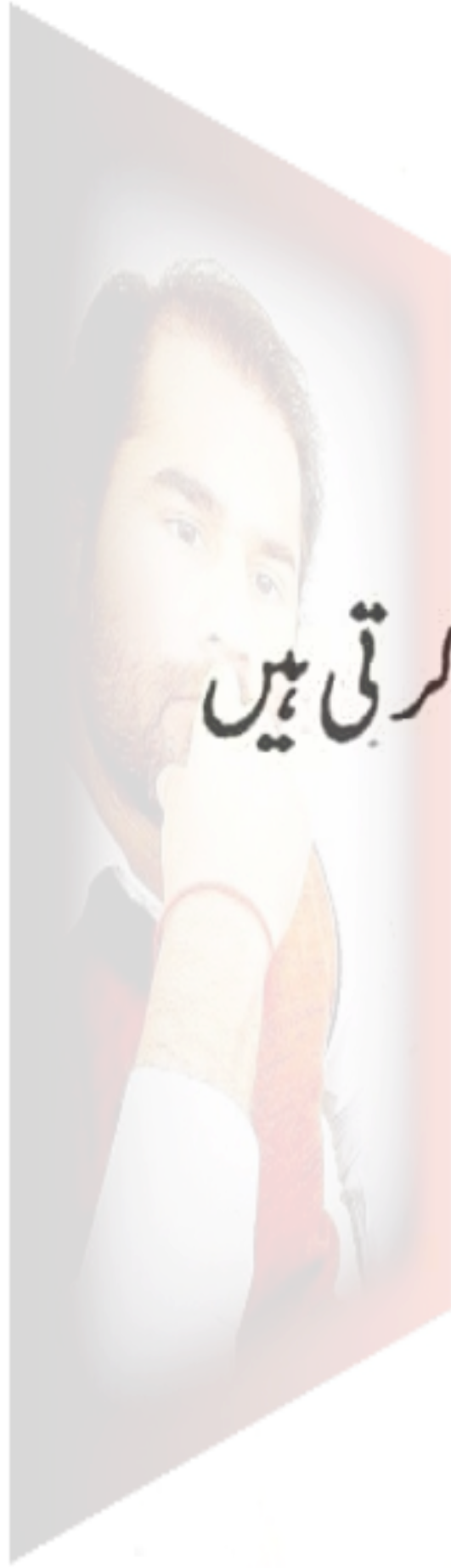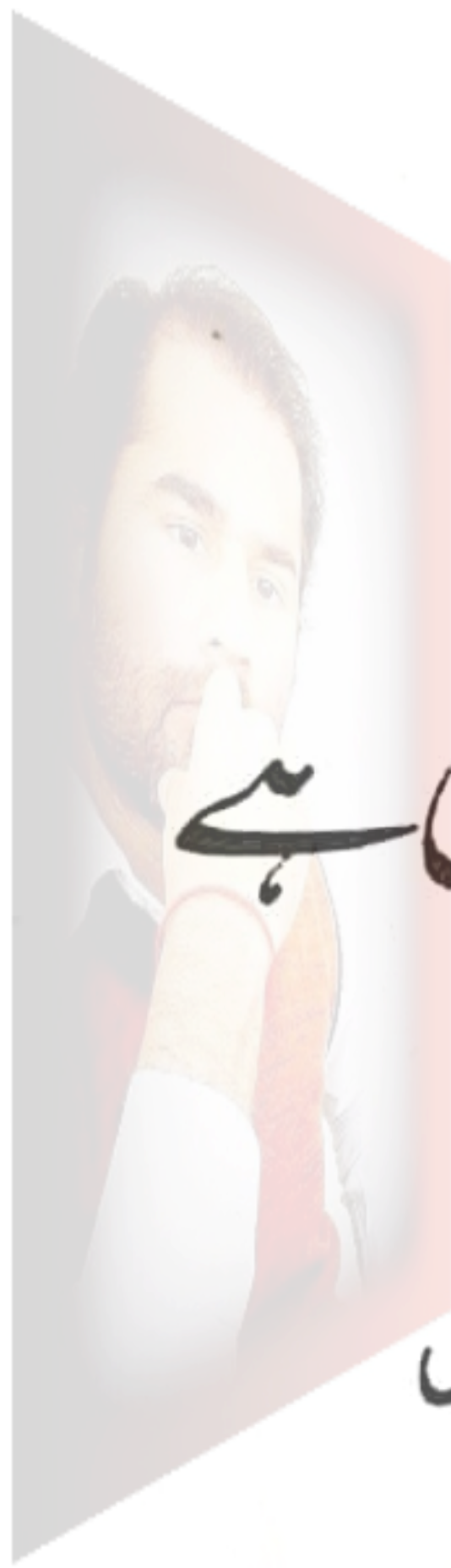
# اور بارش ہے

اپنی بیکار محبت کی سیہ کاری میں
بھیگ جاتا ہوں
تو سو جاتا ہوں
اور بارش ہے کہ گرتی ہی چلی جاتی ہے
بند آنکھوں پہ
تھکے اعضا پر

شہرِ نم ناک میں
سانسوں سے بھری گلیوں پر
اور راتوں کی گھنی شاخوں میں
نارسائی کی طنابوں سے بندھے جسموں پر
اور ناکردہ گناہوں کے
تعفن زدہ کپڑوں سے بھرے کوٹھوں پر
اور بے انت کے میدانوں میں ———!
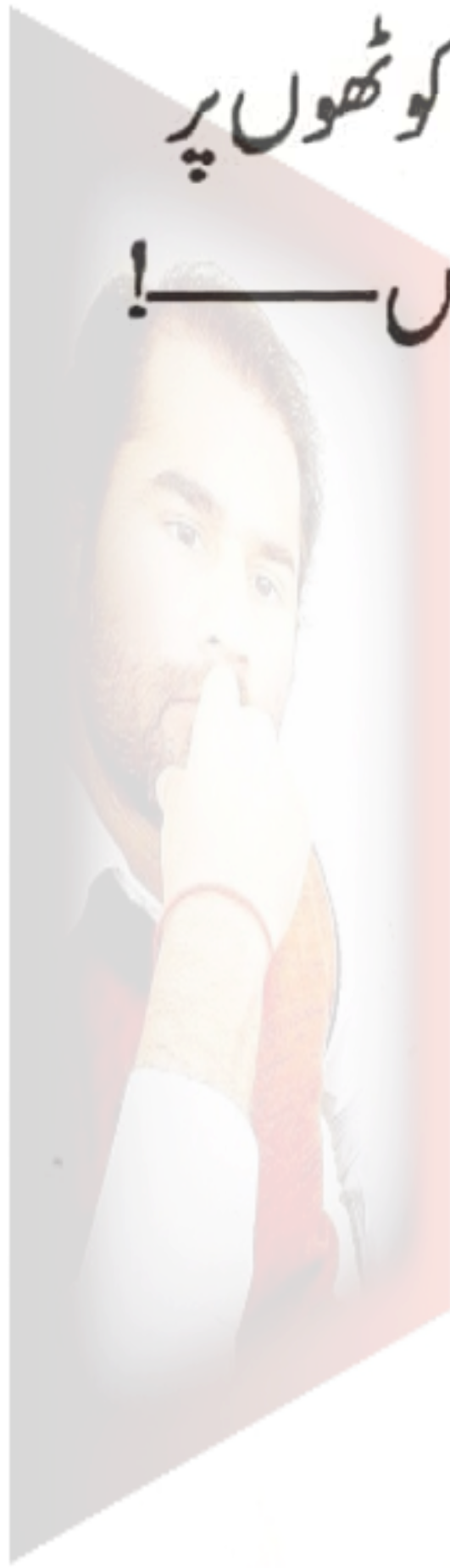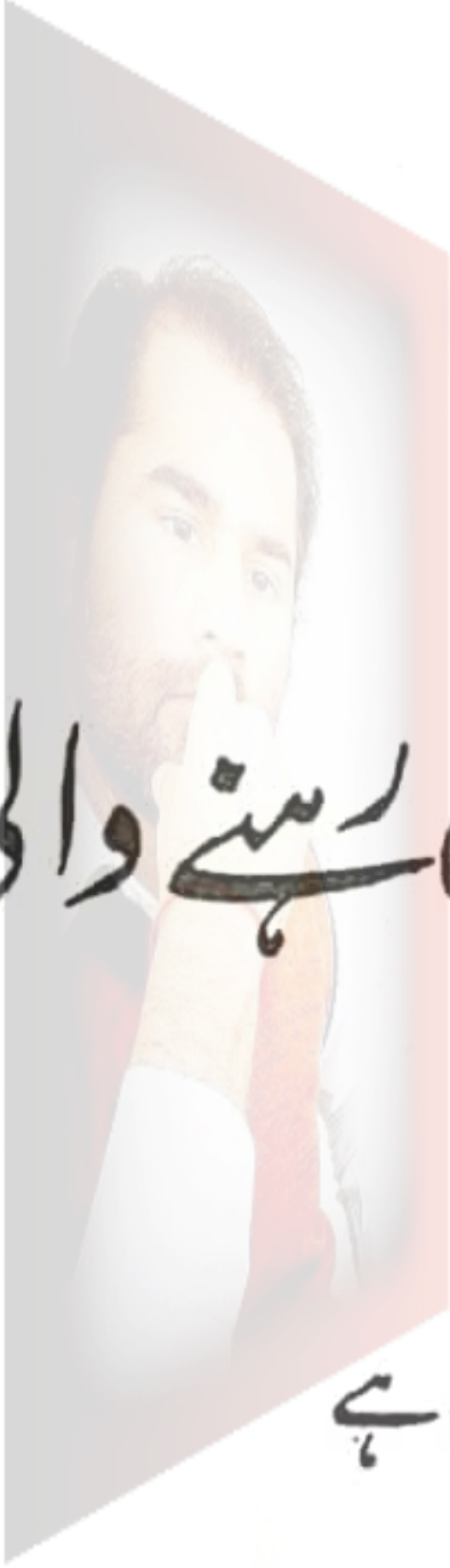
# نمناک صداؤں میں رہنے والی

وہ تخلیق کی گود میں سسکیاں لیتی ہے
اس کی ہچکی، نم سانسوں میں
ننھے منے بچوں کی آنکھیں اٹکی ہیں
اور لرزتے ہونٹوں سے
جو لفظ، رہا ہوتے ہیں
ہندسے بن جاتے ہیں

اس کی شکستہ بانہوں کے جھولے میں
چہرے کھیلتے ہیں
سرما جیسی
اس کے خوابوں کی چادر
سورج مانگ رہی ہے ——
اس کے ہاتھوں میں ریشم کے موزے ہیں
جن میں اس کی انگلیاں
نرمی۔ اور گدازسی لذت میں
چلتی رہتی ہیں
قدموں میں اک پیاس کی بوندیں
سہمی آوازوں کا پانی
میں، یخ بستہ خون میں
اس کی آہٹ سنتا رہتا ہوں
لیکن اک دن وہ
میری آنکھوں میں ٹھنڈی ہو جائے گی

# دن گزرتے رہے

سیلِ بے آب میں
عمرِ بے خواب میں
صبحِ شب تاب میں
ایک رنجِ مسلسل کے پھیلے ہوئے
گہرے بادل میں، آنکھیں لپیٹے ہوئے
کام چلتے رہے

نام بنتے رہے
زرد پیلے دنوں کے تسلسل میں اک عاجزی
پیر پھیلائے لیٹی رہی
چار اطراف پھیلے
دھوئیں کے غلافوں میں اترے ہوئے
موسموں کے پر اسرار رستوں کی دہشت میں
گرتی ہوئی سرخ اینٹوں کے کہرام میں
تنگ گلیوں کی چھت سے ٹپکتے ہوئے
سرد' اوندھے کٹوروں کی بارش میں جھکتے' سنبھلتے
ہوئے
وقت پاگل کی اک خود کلامی کی صورت لپٹتا ہوا
اس مسافت کی دھول
اور رستوں کی سختی میں ہم
عمر کے فاصلے کاٹتے' سر جھکائے ہوئے
زینہ زینہ اترتی ہوئی رات میں
خواب ڈوبے ہوئے
یہ ستارے' زمیں' آسماں
خاک میں ان کی ہمسائیگی کی علامات بکھری ہوئیں

وقت کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے
دن کے ماتھے پہ' خوابوں کے بوسے بجھے'
ان لکھے نام
حرفوں کی صورت بناتی ہوائیں بکھرتے ہوئے'
ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
کہ ہم اجنبی تھے
ہمیں۔ لمس' تائید کے زعم میں
ایک گہری' گھنیری پنہ گاہ تھا
ایک دوجے سے تادیر لپٹے رہے
دیر تک اپنے سایوں سے لڑتے رہے
دن۔ گزرتے رہے!

# مَیں نے اس کو دیکھا تھا

میں نے اس کو دیکھا تھا
جب پہلے پہل
ان نیند بھری گلیوں میں اس نے
اپنی چاپ جگائی تھی
بھیدوں بھرا لبادہ
اس کے جسم پہ تھا

دھان کے کھیتوں کی خوشبو
کپڑوں میں تھی
اور بالوں میں
اس کے اپنے نام کی،
مٹتے نام کی مٹی گندھی ہوئی تھی
دھند میں الجھی شاموں میں
وہ ریستوران کی اوٹ میں بیٹھ کے
اپنی آگ جلاتا تھا
اور ٹھٹھرتی راتوں کی خاموشی میں
اک آواز لگاتا تھا
میں نے اک دن دیکھا تھا
اس کے بنجر ہاتھوں کی سختی میں
موسم ٹوٹ رہے تھے
جھاگ اڑاتے دریا
کالے سینے سے بہ نکلے تھے
اور غصیلی آنکھوں میں
اک پاگل خوف کی سنگینی تھی
دور کہیں پر
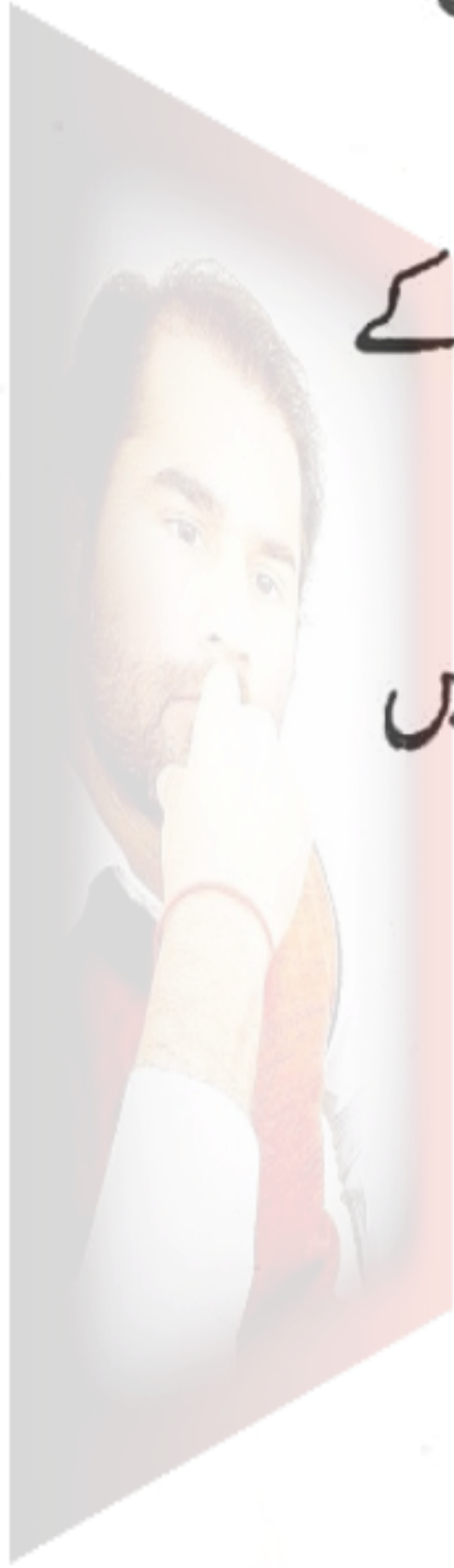
کھیتوں میں بارش گرتی تھی
میدانی رستوں کی بانہیں کھلی ہوئی تھی

۲
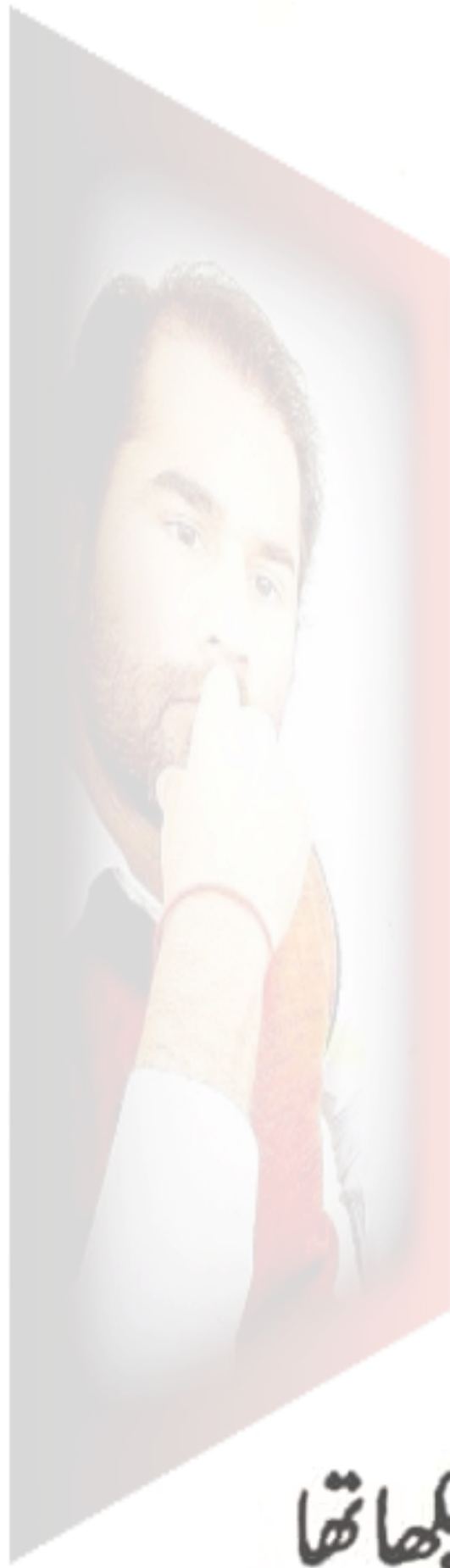
ریستوران کی اوٹ میں
جلتی آگ پہ پانی برس رہا تھا
اور دھوئیں کی کڑوی خوشبو
سانسوں میں اتری جاتی تھی
میزیں اس پر الٹ گئی تھیں
اک مکّار خموشی میں
دروازے اس پر بند ہوئے تھے
میں نے اس کو شہر کے چوک میں دیکھا تھا
گدلی راتوں کا کیچڑ
میلی آنکھوں میں پھیلا تھا
بھیدوں بھرا لبادہ
کانپتے ہاتھوں سے پھسلا جاتا تھا

اس کے مٹتے نام کی
مرتے نام کی مٹی
چہروں پر اڑتی پھرتی تھی
اور ہوا کے دوش پہ اک بے نام صدا
بے خواب مکانوں میں تھک کر
گرتی جاتی تھی

# بات کیا تجھ سے کروں

بات کیا تجھ سے کروں
دن ——— !
کہ مرے ماتھے پر
تیری دستک کی سیاہی میں بجھے جاتے ہیں
کتنی راتوں کی اداسی میں سلگتے ہوئے
لفظوں کے اجالے

جو چھپا رکھے تھے
اپنی سانسوں میں
تری رہ پہ بچھانے کے لیے
دن ـــــ!
کہ جلا ڈالے ہیں
اپنے تپتے ہوئے ہاتھوں کی کڑی سختی میں
تو نے وہ لوگ
جو کملائی جبینوں پہ اٹھا لائے تھے
تیرے جھلسے ہوئے چہرے کے لیے رنگ
ترے پاؤں میں دھرنے کے لیے
دن ـــــ!
کہ اجالے نے ترے
کیسا اندھیر مچا رکھا ہے!
بات کیا تجھ سے کروں
رات ـــــ!
کہ آنچل میں ترے
منہ چھپائے ہوئے گھر سوتے ہیں
شہ نشینوں پہ تری چاپ کے ساتھ
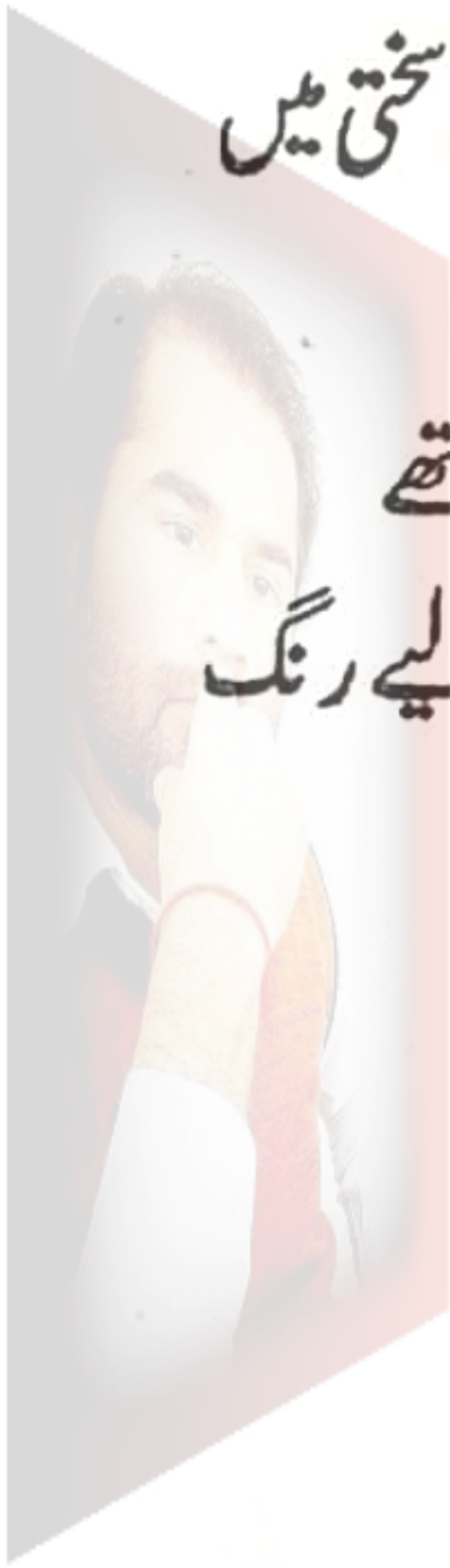
کتنی آنکھیں، مرے سینے میں بھر آتی ہیں
تیری بے انت خموشی کے جنگل میں
کتنے خوابوں کے خنک چاند
اتر جاتے ہیں
اور شاخوں سے تری
کوئی مہکار تلک آتی نہیں
تیری آواز، مجھے بھاتی نہیں
بات کیا تجھ سے کروں
عمر ــــــــ!
کہ تھک جاتا ہوں
اور نم ناک منڈیروں سے
میرے دن رات پھسل جاتے ہیں
تیری ممتا بھری چھاتی کی دکھن
میرے ریشوں میں اتر جاتی ہے
اور اڑتے ہوئے بالوں میں
میری آواز، بھٹک جاتی ہے
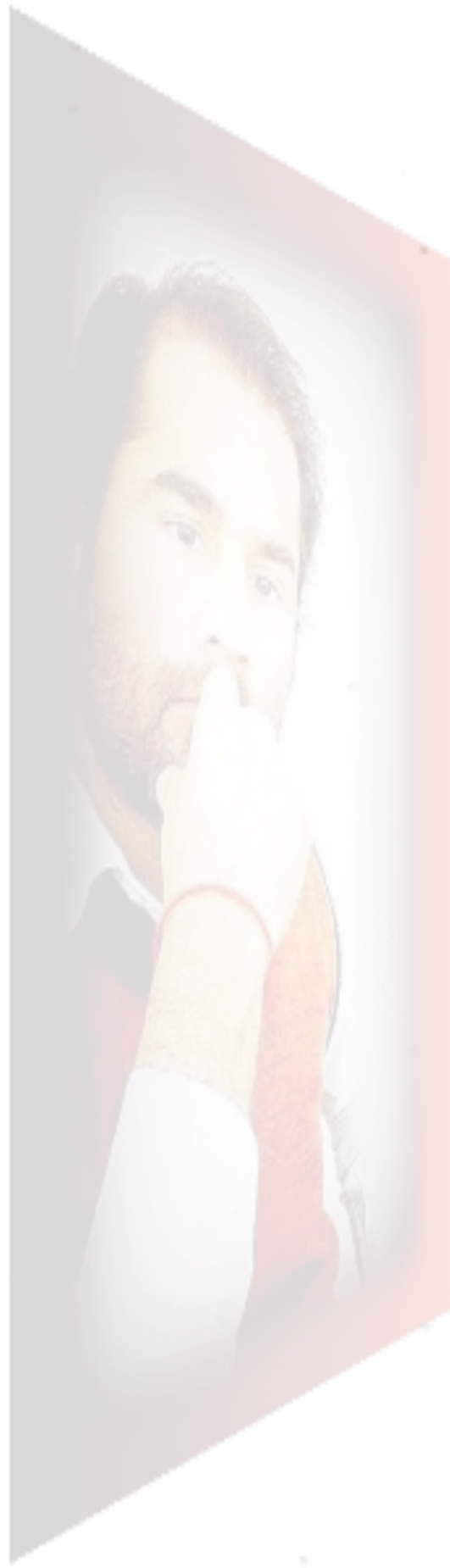
# ہر سال کی آخری نظم

پیاس ہے ' ہر طرف
پیاس ہی پیاس ہے
سر پہ بادل جھکے ہیں
برستے نہیں
راستوں پہ ازل سے رواں
قافلوں کے قدم ۔ ڈولتے بھی نہیں

فاصلے بولتے بھی نہیں
وقت کی دھند میں
سہمے سمٹے ہوئے
ان مکانوں کی خاموشیوں کے لیے
دل پہ اک بوجھ ہے
جن کے آنگن
کسی نرم چاہت کی صبحوں کی خاطر کشادہ نہیں
ایستادہ نہیں
منزلوں کے لیے
جن کی سمتوں پہ گہرا
اندھیرا تنا ہے
جو چھٹتا نہیں
دربدر سر پٹکتی ہوا کے لیے
جس کی آہٹ پہ در کوئی کھلتا نہیں
اپنے دل کے مسافر کی خاطر
کہ جس کو کوئی راہ ملتی نہیں
دوستوں کے لیے
جن کے ہونٹوں سے گرتے ہوئے لفظ

سانسوں میں الجھے ہوئے خواب کے شور میں

ڈوب جاتے رہے ——

تھکن اور بیداریوں کے تسلسل میں بھٹکی ہوئی

جن کی آنکھیں

یہ منظر —— بدلتے ہوئے دیکھنے کے لیے

خاک ہونے کو ہیں

اپنے اطراف میں



شور و غل کے غلافوں میں اتری ہوئی

خامشی کے لیے



دل پہ اک بوجھ ہے

معبدوں کی اداسی میں ٹھہرے ہوئے

آنسوؤں کے لیے



ان دعاؤں کی خاطر

جو بے معنی لفظوں میں اپنے لیے راستے ڈھونڈتی ہیں

---

لرزتے ہوئے آسماں کے لیے

اس زمیں کے لیے

جس پہ بادل جھکے ہیں

برستے نہیں
پیاس ہے، ہر طرف
پیاس ہی پیاس ہے!
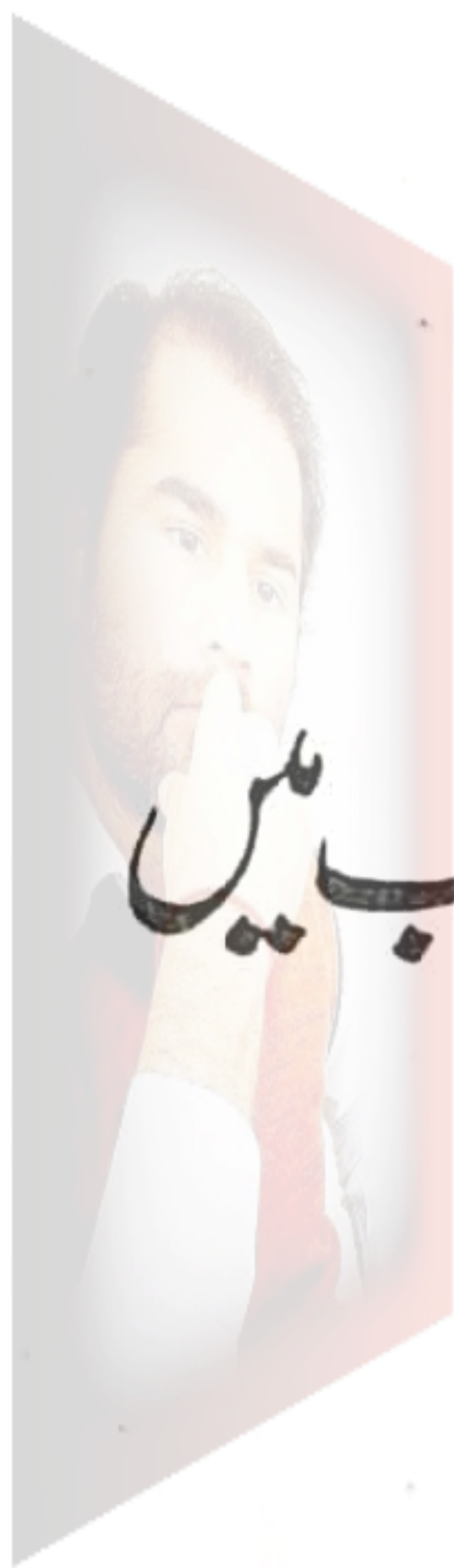
# عرصۂ خواب میں

نقش بر آب ہیں
عرصۂ خواب ہیں
واہموں کی سیاہی میں
کھلتے ہوئے راز ہیں
اپنے ہونے نہ ہونے کی ساعت میں
اپنی ہی تانوں میں الجھے ہوئے

ساز ہیں
رنگ جمتے نہیں
دن بدلتے نہیں
دوریوں کے سوا، کچھ بھی ملتا نہیں
راس، کچھ بھی نہیں
پاس کچھ بھی نہیں
اے زمان و مکاں ——!
دوریوں کے ابد خواب میں
وقت کی سرمئی آہٹوں میں چھپے
ایک دھندلے جہاں
بے جہت آسماں
اپنی آنکھوں پہ مٹی کی چادر لپیٹے ہوئے
روز و شب میں رواں
جانی، انجانی بے چارگی
اور دلوں میں، بدلتے ہوئے موسموں سے اترتی
اداسی کے کہرے میں اپنے
سوالوں کی یخ بستہ خاموشیوں کو سنبھالے ہوئے
ناتواں
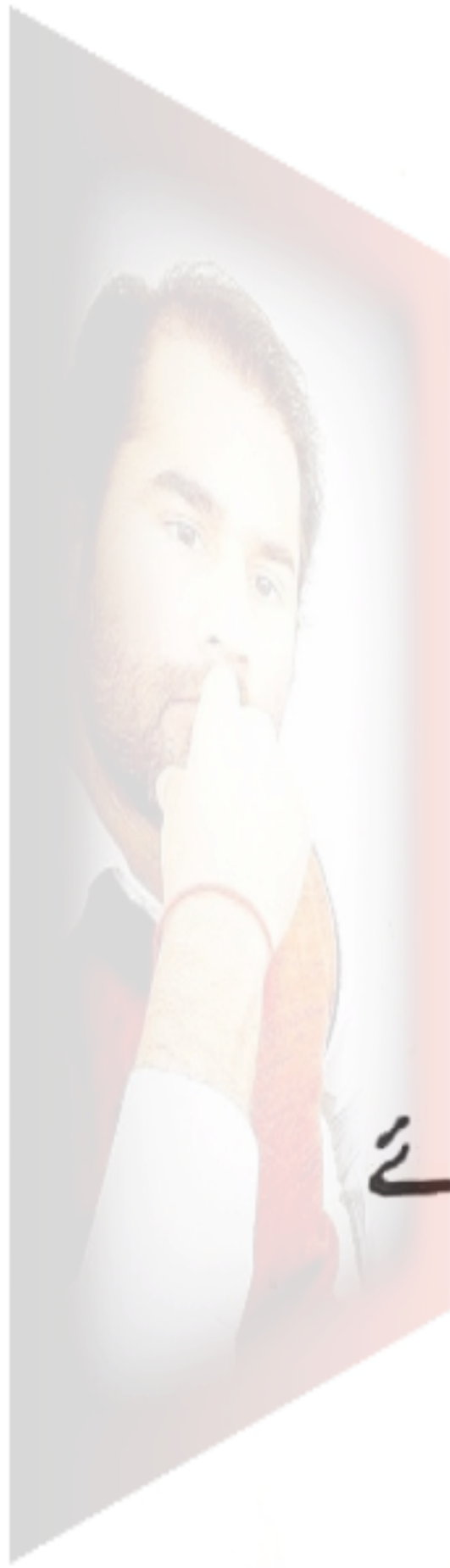
اپنے قدموں پہ جھکتے ہوئے
دکھتے شانوں پہ دھرتی اٹھائے ہوئے
اپنے منظر کی تشکیل میں
ڈھونڈتے ہیں تجھے
معبدوں کے دھندلکے میں بھیگی ہوئی
اے نگاہِ حزیں
کون ہے تو
ترے بعد بھی کیا نہیں؟

راس آئے گا کیا
اے دلِ بے یقیں
اپنی عمروں کی قبروں میں سہمے ہوئے
کب تلک
تیری جانب یونہی دیکھ پائیں گے ہم؟

# لوری

یہ سارے کھیت، جنگل، پھول، میداں
یہ رستے خاک میں لپٹے ہوئے
حدِّ نظر سے تا ابد
اک دھند کی چادر میں سہمی بستیاں
اور وقت کا پھیلاؤ ——
اسی معمورۂ ظلمت کے اندر

ہمارے زرد روناموں کے تارے ٹوٹتے ہیں
اور مدھم سی لکیریں چھوڑ جاتے ہیں
میں اس ابہام سے خوش ہوں
تمہارے نام سے خوش ہوں
ہمارے ساتھ جو کچھ وقت کر جاتا ہے
میں اس کام سے خوش ہوں

# غیر آبادیوں میں ایک نظم

دور تک

غیر آبادیوں سے پرے

وقت اور خواب مل کر بناتے رہے

تیرے ہونے کے نام و نشاں

دل دکھاتے رہے

دھیرے دھیرے گزرتے مہ و سال

تیرے جلووں میں چمکتے مہکتے ہوئے

اور ہم ———

دشت و صحرا میں

اونچے پہاڑوں کے دامن میں

کڑوے کسیلے زمانوں کی سیٹی بجاتی ہوا

اپنے سینے میں تھامے رہے

اجنبی آشنائی کی آہٹ میں محبوس

اپنی زمیں کے لیے

نم زدہ سانس بن کر رہے

دل گرفتہ رہے

راتوں میں جب گہرے سناٹوں کا شور ابھرتا ہے

دوری کی معدوم اوٹ میں

تیری تھکی ہوئی آواز اتر جاتی ہے

آج بھی جب دھیرے دھیرے صبحِ کاذب کی خنک ہوا

چلنے لگتی ہے

ان ہونے خوابوں کے پھول لرز اٹھتے ہیں

دن میں آنکھیں، لوگ، مکان
ڈھیروں باتیں
اک بیکار الجھاو
رات کو ایک اکیلا کمرہ
اور برفیلی سیٹی۔ سانس
آنکھوں میں اتری جاتی ہے
تیری گہری گہری خاموشی کی رنگت
میں بھی چپ ہوں تو بھی چپ ہے
اور ہمارے ہونٹوں پر
افلاک سے بارش گرتی ہے!

# نہ جانے ہم کس طرح ملے تھے

**انوار احمد** کے نام

یہ دھند کیسی کہ تیرے رستے
کبھی مرے راستوں سے آ کر گلے ملے ہیں
کبھی کسی دوار کی کھٹک میں
کبھی کسی سانس کی دھمک میں
بچھڑ گئے ہیں یہ راستے
اپنے اپنے قدموں تلے کی گہری زمین کو بھی

انہیں درختوں میں تیرا چہرہ
طویل رستوں پہ پھیلتی دھند کی ردا میں اتر گیا ہے
نہ جانے ہم کس طرح ملے تھے
یہیں کہیں تو نے آنسوؤں سے بھگوئی مٹی
اور آج بھی خاک میں ہے تیری صدا کا کنکر
ترے مرے خواب کی ردا سے —— ٹپکتی بوندوں
میں بھیگتا ہے
یہیں کہیں کے ہی راستوں نے
لپیٹ لی ہیں تمام عمریں
جو تیرے میرے لہو کے خوابوں کی سلطنت تھیں
ہماری سانسیں طویل کرنے کی منزلوں پر کھڑی ہوئی تھیں
نہ جانے ہم کس طرح ملے تھے
نہ جانے ہم کس طرح جدا ہیں
مکان ہیں ' ان میں چپ کی ارتھی
تمام آنگن ہواؤں کی سسکیوں سے لبریز اور گم ہیں
کبھی کبھی تیری گم شدہ سمت کو ہلاتا ہوں ہاتھ اپنے
وہی مرا دستکوں کی گردش میں
مضمحل اور اداس چہرہ
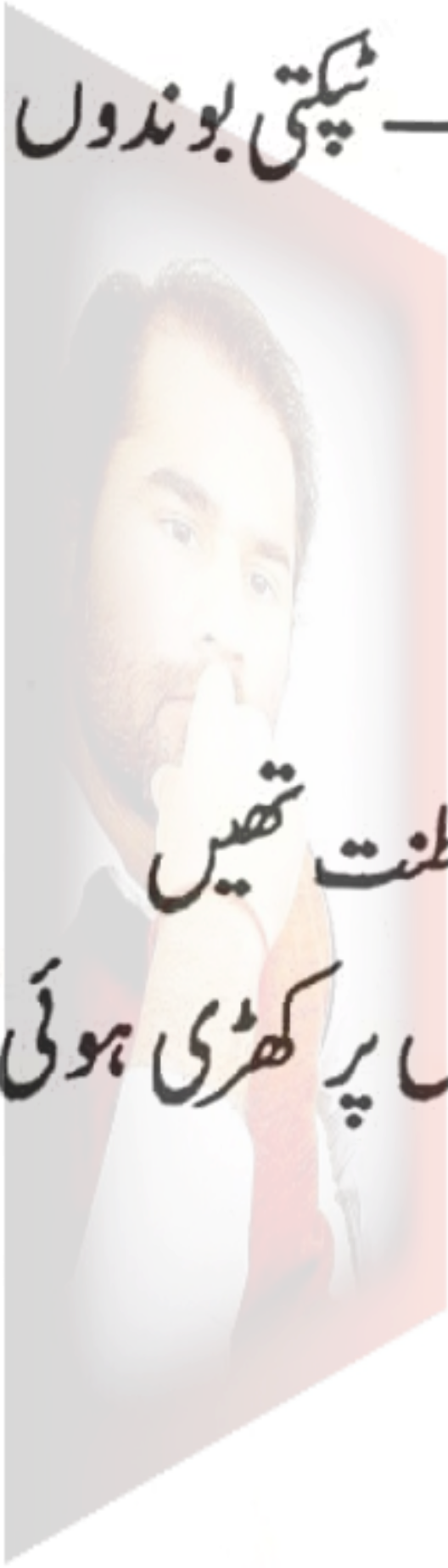
تجھے کہاں میں دکھائی دوں گا
کہ اب تو میں زندگی سے ہارے ہوئے قبیلے کا آدمی
ہوں ـــــ
اسی زمیں کی ترائیوں میں گرے پڑے ہیں
ترے مرے ماہ و سال سارے
ملال سارے
نہ جانے ہم کس طرح ملے تھے

# مجھے ڈر لگتا ہے

آو ہم آج ہی کھل کر رو لیں
جانے کب وقت ملے
آنکھ میں جتنے بھرے ہیں آنسو
آؤ ہم آج بہا دیں ان کو
گھات میں عمر بھی ہے
وقت بھی، رفتار بھی ہے

کون جانے کہ ملیں راستے کب منزل سے
کون جانے کہ رہا ہوں گے سفر سے کب تک
کون جانے یہاں کس رت کی ردا سے اتریں
پھول، جن میں تری مہکار نہ ہو
کون یہ جان سکے، تیرے حروف
میرے ہونٹوں سے کہاں ٹوٹ گریں
شہرِ آئندہ کے بت خانے ہیں
کیا پتا اک تری تصویر نہ ہو
یوں تو اب کیا ہے جو کھونا ہے مجھے
اب تو بس چین سے سونا ہے مجھے
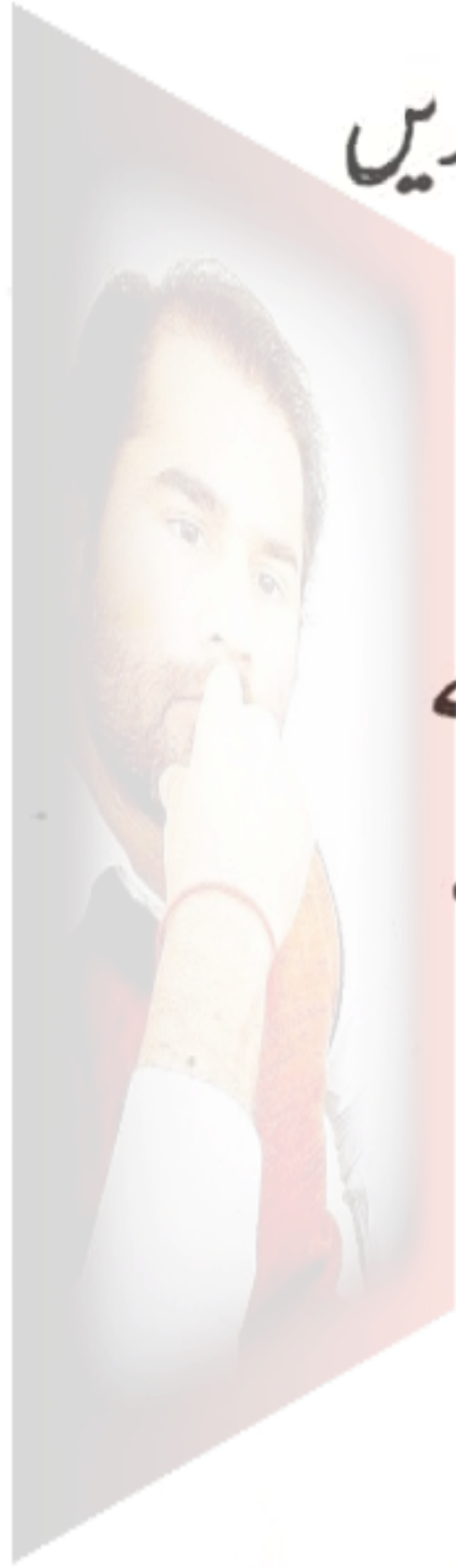
# دائرے ختم کہاں ہوتے ہیں

اور وہ شام عجب تھی
جب زمینوں سے اٹھے رستے ——
مری آنکھوں سے نکلے تو مجھے یاد آیا
دائرہ دائرہ رستوں کی خنک بستی میں
کوئی بھیگی ہوئی آہٹ میں چلا کرتا تھا

اور یہ شام عجب ہے
میں نے نم ناک ہواؤں سے کہا
"دائرے ختم کہاں ہوتے ہیں
اس کی بستی سے جو گزرو
تو مرے نام کی اک بوند ـــــــ گراتی جانا"
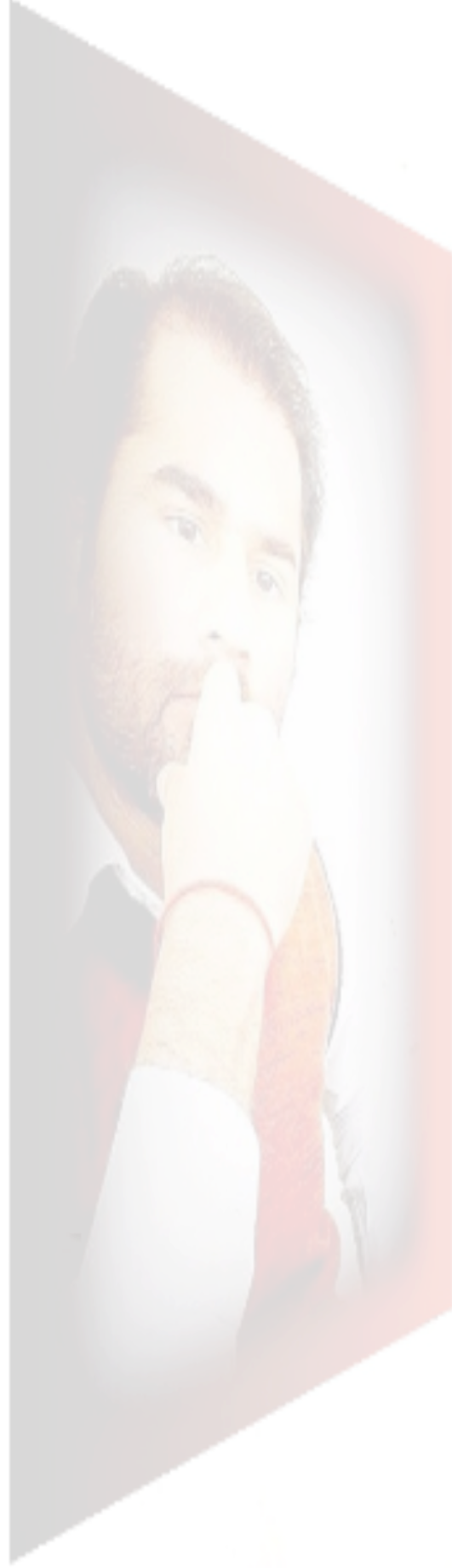
# تھکن زدہ امانت کی واپسی

دور تک پھیلے آفاق میں سنسناتی ہوا
تیری سانسوں کی چاہت میں ہے
تو مری سانس کیوں کھینچنا چاہتا ہے ——
دیکھ
سینے کے اس خول میں کچھ نہیں ہے
فقط گھونٹ ہیں کچھ، ہوا کے

ہے جن پر زمانوں سے اڑتی ہوئی
دھول کی زرد کائی ـــــــ
اجنبی!
میں نے تاریک گلیوں میں
برفیلے لمحوں کو آنکھوں سے چھوتے ہوئے
عمر جھیلی
مری آنکھ نم ۔ نیند ہی زندگی ہے یہاں
اجنبی!
یوں ہوائیں، نمی لے اڑیں گی
تو مری آنکھ میں تیرتے خواب، پلکوں سے چن لے
کہ میں یہ امانت
بہت دیر تک تھام سکتا نہیں!

# مجھے اچھے لگتے ہیں

مجھے اچھے لگتے ہیں
بادل۔ جب وہ برستے ہیں
اور آنکھیں جن میں کوئی بھی بسیرا کر سکتا ہے
بکریاں اور بچے
جو سڑک پار کر جاتے ہیں
اور نہیں دیکھ پاتے اس آہنی ہاتھ کو

جو ان کے تعاقب میں دوڑا چلا آتا ہے
ڈاکیے کے قدم اور انسومنیا کی چائے
اور بجھی بتی کا موٹر سائیکل
جو اشارہ کاٹتے ہوئے
رات میں راستہ بناتا گزر جاتا ہے
مجھے اچھے لگتے ہیں
باغی' نیند' درخت اور خواب
جو اس بیداری کے موسم میں کہیں دکھائی نہیں دیتے
مجھے اچھے لگتے ہیں
فراغت اور دکھ سے بھرے دن
اور راتیں
جب دور دور تک بارش ہوتی ہے
اور آبائی مکانوں کی وہ شام
جب بہنوں کو رخصت کیا جاتا ہے
پہاڑ کے پار کے اندھیارے کی جانب
آنسو اور دھند
جن میں صاف دیکھا جا سکتا ہے
اور وہ دل جنہیں نشانہ بنایا جاتا ہے
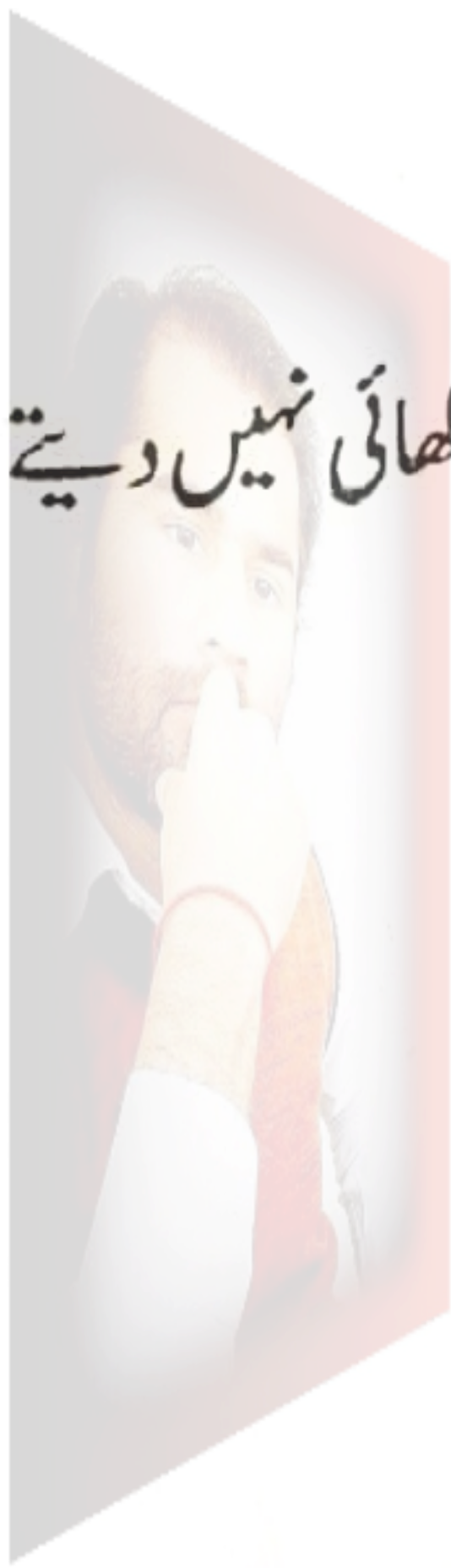
اور مٹی جس کی جانب ہمیں لوٹنا ہے
مجھے اچھے لگتے ہیں
دریچے جن سے ہوا گزرتی ہے
دروازے جو کبھی بند نہیں ہوتے
اور دوست جن کے کندھوں پر ہمیشہ ہاتھ رکھا جا سکتا ہے

اور تم ——!

لپکتے ہوئے ہاتھوں اور دنیا کے درمیان
کیا کچھ موجود ہے!

# روئی ہوئی آنکھ سے

روئی ہوئی آنکھ سے
دنیا بہت صاف دکھائی دیتی ہے
بچہ بہت خوبصورت ہے
اس کی وردی میلی ہو جائے گی
اور باپ کا ہاتھ
اسے کسی بھی موڑ پر چھوڑ دے گا

دن بہت اجلا ہے
اسے گدلا کر دیں گے یہ ہاتھ
رات بھر ہوا چلے گی
ٹھنڈی' تاریک' منہ زور
رگوں میں اتر جائے گی
پھر بھی ——
بارش ہو رہی ہے
بارش میں بھیگتے کپڑے اور راستے
مجھے اچھے لگتے ہیں
کیوں نہ بارش میں کہیں دور نکل جاؤں
لیکن رات ہو گئی ہے
اور ابدی جدائی کی سمت
کھلنے والی یہ کھڑکی
اور تمہاری آنکھیں
بھر جائیں گی اندھیرے سے ——
محبت دکھ تو دیتی ہے
لیکن یہ دکھ بہت گہرا ہے
نیند کی طرح

مٹی میں اترے ہوئے پانی کی طرح
میرا شہر
میری مٹی بن گیا ہے
مجھے زمین مل گئی ہے
رہنے کے لیے
اور اوڑھنے کے لیے



یہ ہارا ہوا دل
ایک مرتبہ پھر
تمہارے سینے میں دھڑک لینا چاہتا ہے
تم کہاں ہو؟
دنیا میری باتوں پر ہنستی ہے
اور میری پرانی گاڑی
چھینٹے اڑاتی ہے
جو سب سے زیادہ
میرے اپنے لباس پر پڑتے ہیں

دلوں سے دہلیزوں
اور خوابوں سے تعبیروں تک کا سفر
طے کرتی ہیں آنکھیں
یا قسمت
یا پھر طے ہو جاتا ہے یہ سفر
محض اتفاق سے

اور ہر سفر کی اپنی منزل ہوتی ہے
اور اپنی صعوبت
اور آدمی کے پاس ہوتی ہیں
صرف آنکھیں
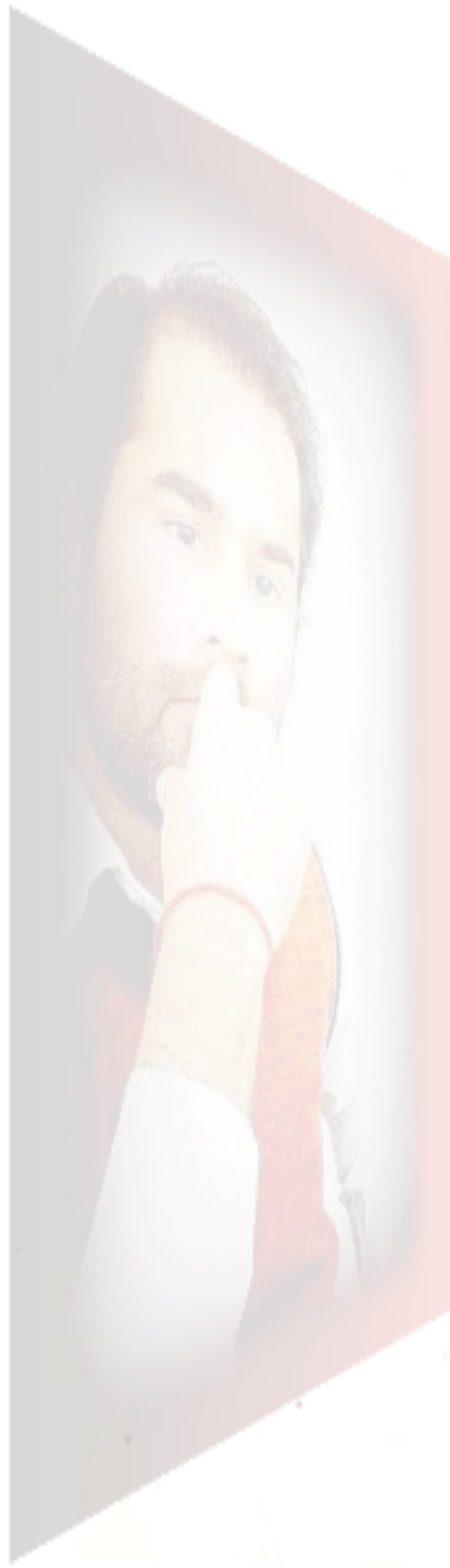
آنکھیں دیکھتی ہیں
دور کے راستوں کو
اور رگوں کو بھر دیتی ہیں
موسموں اور منظروں کی آگ سے
اتار دیتی ہیں تھکن
اور دیکھتی رہتی ہیں
رات دن چمکتے جگنوؤں کی طرح
تھوڑا زادِ سفر باندھ لیتی ہیں
یادداشت کی گٹھڑی میں ——
ہنستی ہیں
اور دیکھتی رہتی ہیں
کھلتے ہوئے پھول
بارش میں بھیگتے ہوئے

درخت اور آدمی
دریاؤں کے کنارے،
آبادیوں میں اترنے والی شام
مسکراتی ہوئی دھوپ
اور مکتب سے نکلتے بچوں کی
اجلی وردیاں ——
روتی ہیں
اور دیکھتی رہتی ہیں
ایڑی میں چبھ جانے والی کیل
اڑتے ہوئے بادل
معدوم ہوتے ہوئے ماہ و سال
ابدیت کے جنگل میں
بھٹکتی ہوئی چاندنی
اور ہاتھوں سے گرتی ہوئی مٹی
آنکھیں نکل جاتی ہیں قدموں سے آگے
اور مکمل کر دیتی ہیں سفر
بھر جاتی ہیں
اور دیکھتی رہتی ہیں
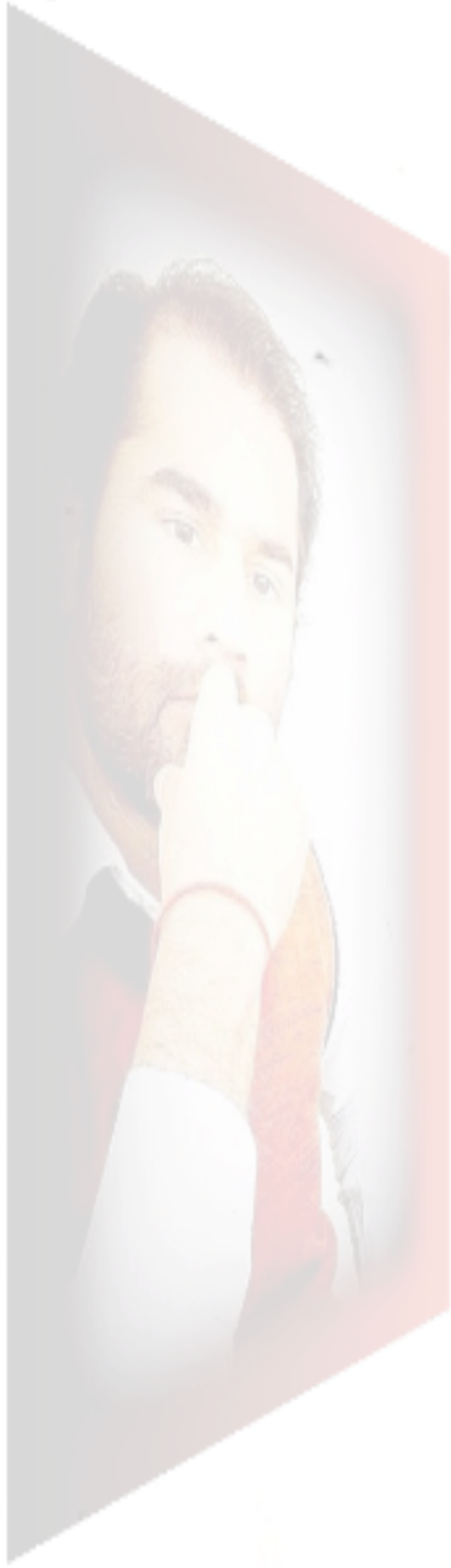
گزری ہوئی بستیاں
اور ان میں ایستادہ ایک گھر
اور دہلیز پر کھلا ہوا پھول
اور آغاز کی سرخوشی اور ملال کے سایے
آنکھیں ——— دیکھتی رہتی ہیں
لیکن تم نہیں دیکھتے
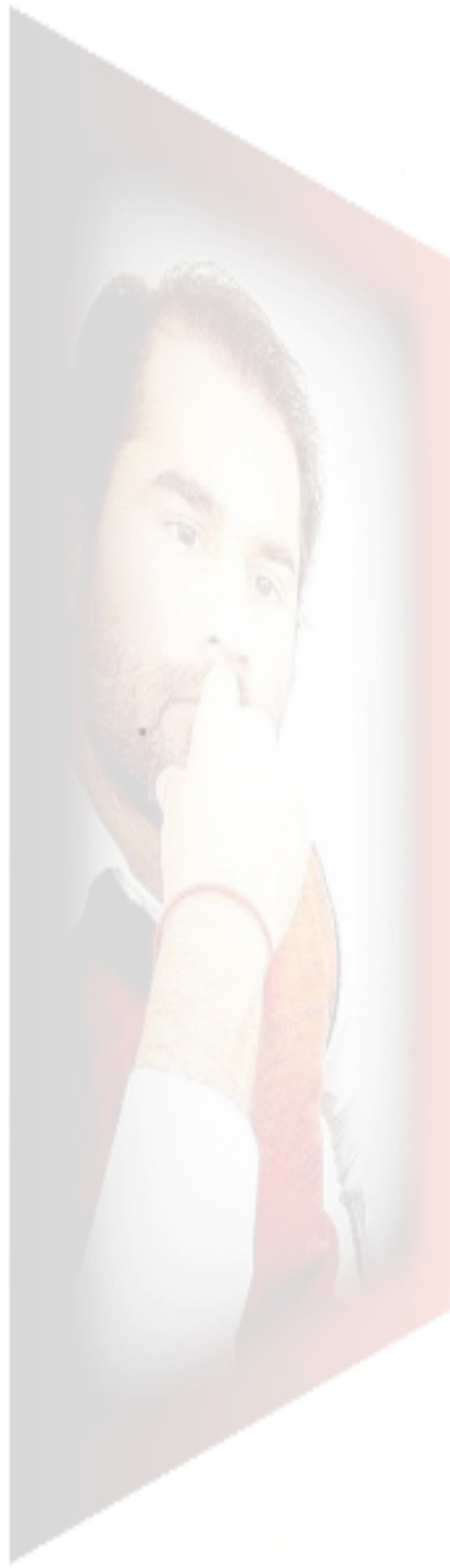
پڑے رہتے ہو
عقب کے اندھیروں میں
لمبی تان کر
اور نہیں جانتے
آنکھیں کیا کچھ دیکھ سکتی ہیں!

# یادوں اور بادلوں میں

چاندنی میں آنکھیں بھیگ گئی ہیں
شاید کہیں کچھ ہوا ہے
کوئی دیوار گر گئی ہے
یا رونے کی آواز آ رہی ہے
کوئی کھلونے بیچ رہا ہے
بچے سکول جا رہے ہیں
یا دروازے پر دستک ہو رہی ہے
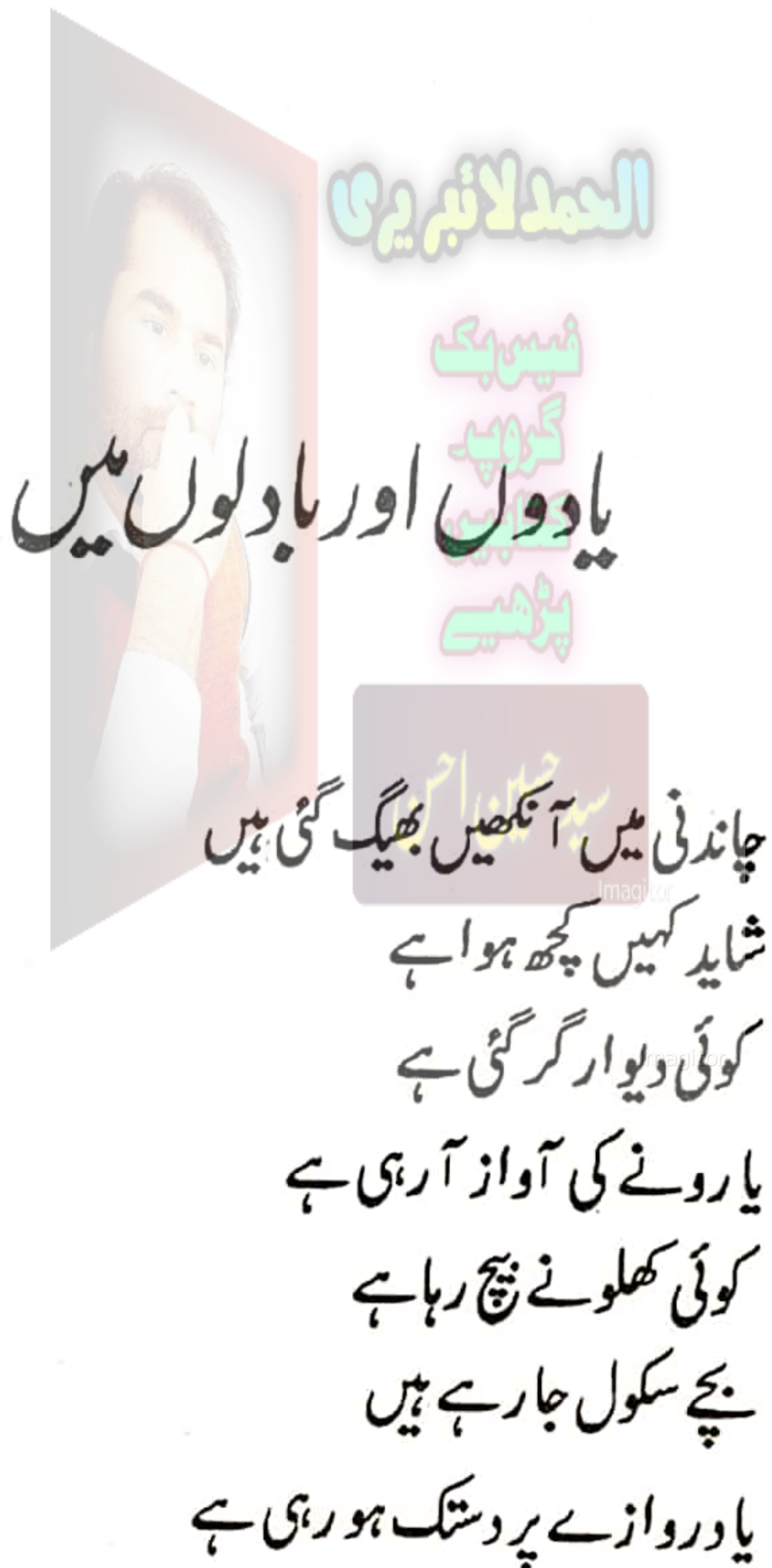
شاید اس لڑکی نے زہر کھالیا ہے
یا پھر وہ بوڑھا پاگل ہو گیا ہے

دیواروں میں پانی سویا ہوا ہے
رات کے دالان میں موتیے کے پھول کھلے ہیں
یا پھر درختوں میں ہوا چل رہی ہے

یادوں اور بادلوں میں گھومنے سے
آدمی بہت دور نکل جاتا ہے
شاید ہوا تیز ہو گئی ہے
یا پھر بادل منڈیروں تک جھک آئے ہیں
اندھیرے میں
ڈوبتے ہوئے ہاتھ دکھائی دیتے ہیں
"تم کون ہو ——؟"
حالانکہ اس سے کیا ہوتا ہے
بارشوں میں مٹی بیٹھ جاتی ہے
خواب دیکھنے
اور نیند میں چلنے والوں کے لیے

کوئی جگہ نہیں

اور پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا
اپنے خوابوں کے ساتھ
نیند کے جنگل میں
یا سو رہوں گا ـــــــ یہیں کہیں
تمھارے آس پاس ـــــــ

# قصباتی لڑکوں کا گیت

ہم تیری صبحوں کی اوس میں بھیگی
آنکھوں کے ساتھ
دنوں کی اس بستی کو دیکھتے ہیں
ہم تیرے خوش الحان پرندے
ہر جانب تیری منڈیریں کھوجتے ہیں
ہم نکلے تھے

تیرے ماتھے کے لیے بوسہ ڈھونڈنے

ہم آئیں گے
بوجھل قدموں کے ساتھ
تیرے تاریک حجروں میں پھرنے کے لیے
تیرے سینے پر
اپنی اکتاہٹوں کے پھول بچھانے
سرپھری ہوا کے ساتھ
تیرے خالی چوباروں میں پھرنے کے لیے
تیرے صحنوں سے اٹھتے دھوئیں کو
اپنی آنکھوں میں بھرنے
تیرے اجلے بچوں کی میلی آستینوں سے
اپنے آنسو پونچھنے
تیری کائی زدہ دیواروں سے
لپٹ جانے کے لیے
ہم آئیں گے
نیند اور بچپن کی خوشبو میں سوئی ہوئی
تیری راتوں کی چھت پر
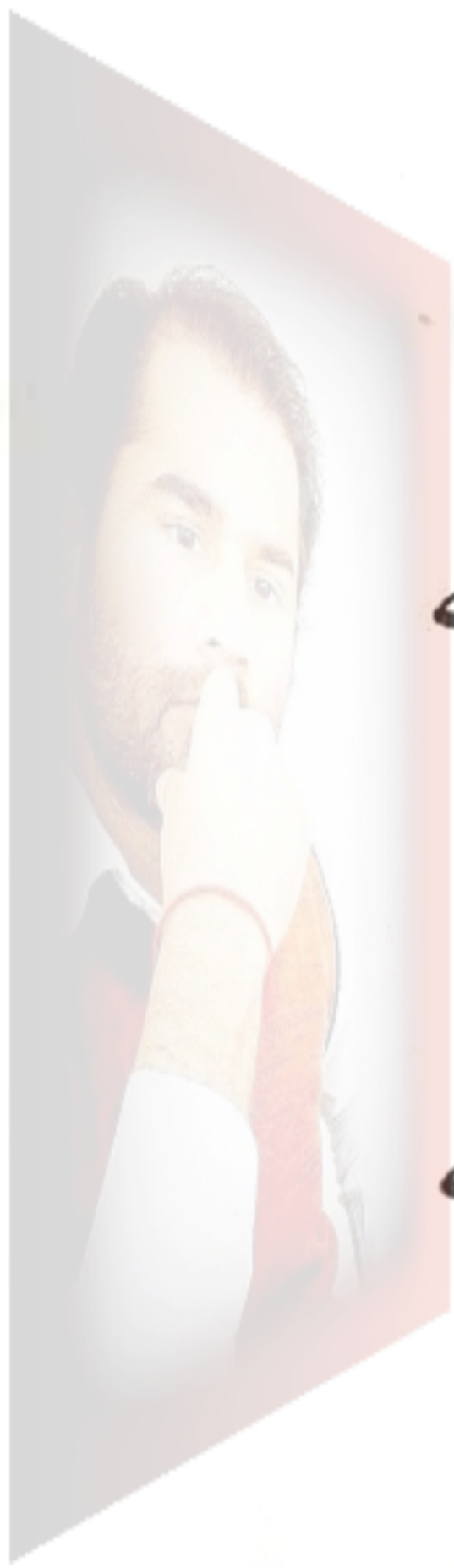
اجلی چارپائیاں بچھانے
موتیے کے پھولوں سے پرے
اپنی چیختی تنہائیاں اٹھانے
ہم۔ لوٹیں گے تیری جانب
اور دیکھیں گے تیری بوڑھی اینٹوں کو
عمروں کے رت جگوں سے دکھتی آنکھوں کے ساتھ
اونچے نیچے مکانوں میں گھرے
گزشتہ کے گڑھے میں
ایک بار پھر گرنے کے لیے
لمبی تان کر، سونے کے لیے
ہم آئیں گے، تیرے مضافات میں
مٹی ہونے کے لیے

# ہمارے دُکھوں کا علاج کہاں ہے

اگر ہمارے دکھوں کا علاج
نیند ہے
تو کوئی ہم سے زیادہ گہری نیند نہیں سو سکتا
اور نہ ہی اتنی آسانی اور خوبصورتی سے
کوئی نیند میں چل سکتا ہے
اگر ہمارے دکھوں کا علاج

جاگنا ہے
تو ہم اس قدر جاگ سکتے ہیں
کہ ہر رات ہماری آنکھوں میں آرام کر سکتی ہے
اور ہر دروازہ
ہمارے دل میں کھل سکتا ہے
اگر ہمارے دکھوں کا علاج
ہنسنا ہے
تو ہم اتنا ہنس سکتے ہیں
کہ پرندے درختوں سے اڑ جائیں
اور پہاڑ ہماری ہنسی کی گونج سے بھر جائیں
ہم اتنا ہنس سکتے ہیں
کہ کوئی مسخرہ یا پاگل
اس کا تصور تک نہیں کر سکتا
اگر ہمارے دکھوں کا علاج
رونا ہے
تو ہمارے پاس اتنے آنسو ہیں
کہ ان میں ساری دنیا کو ڈبویا جا سکتا ہے
جہنم بجھائے جا سکتے ہیں
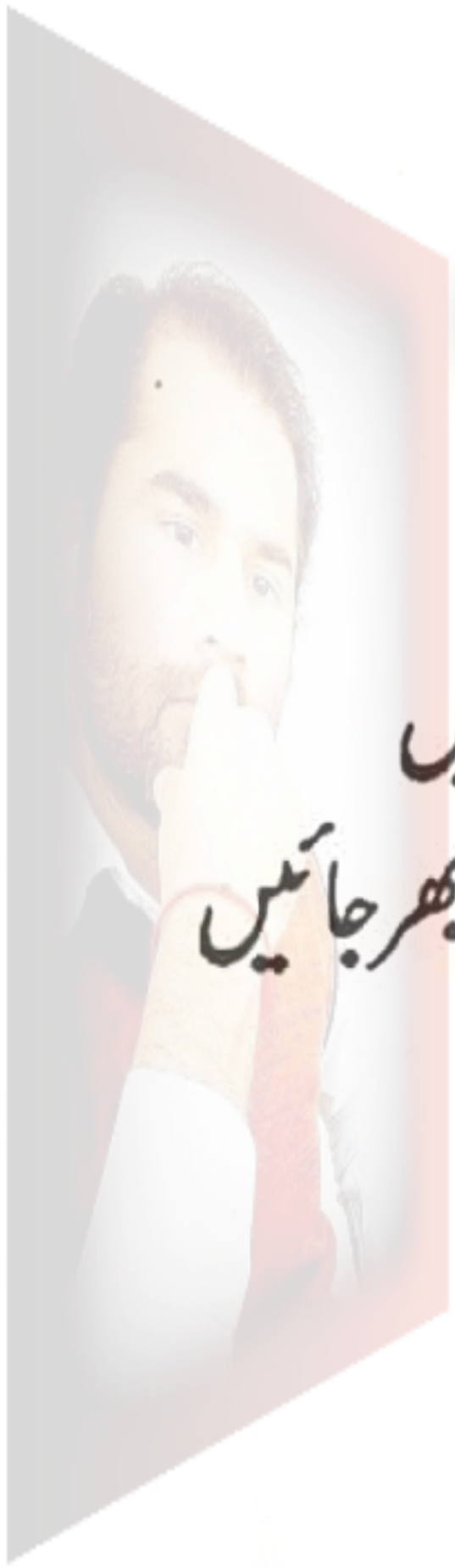
اور ساری زمین کو
پانی دیا جا سکتا ہے
اگر ہمارے دکھوں کا علاج

جینا ہے
تو ہم سے زیادہ با معنی زندگی
کون گزار سکتا ہے
اور کون ایسے سلیقے اور اذیت سے
اس دنیا کو دیکھ سکتا ہے
اگر ہمارے دکھوں کا علاج

بولنا ہے
تو ہم ہوا کی طرح گفتگو کر سکتے ہیں
اور اپنے لفظوں کی خوشبو سے
پھول کھلا سکتے ہیں
اور اگر تم کہتے ہو:
ہمارے دکھوں کا علاج کہیں نہیں ہے؛
تو ہم چپ رہ سکتے ہیں
قبروں سے بھی زیادہ
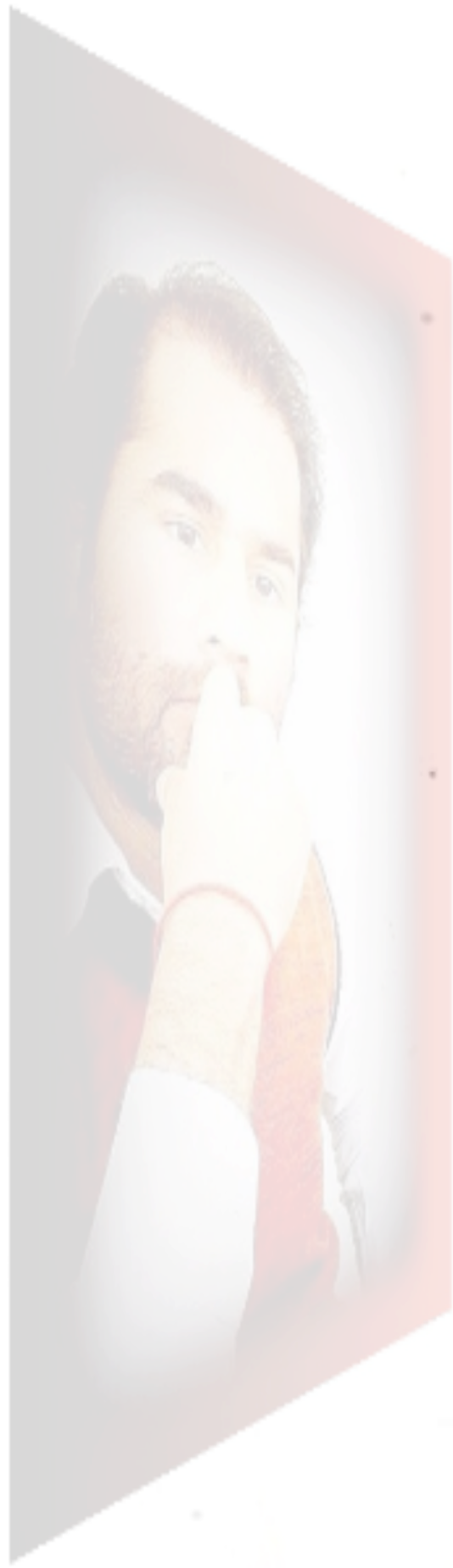
# وہ میری راہ دیکھتی ہے

وہ میری راہ دیکھتی ہے

وہ میری راہ ایسے دیکھتی ہے

جیسے جاگتے میں نیند

یا نیند میں خواب دیکھتے ہیں

منہ اندھیرے کھیتوں کو جاتے ہوئے

کپاس کے پھول چنتے ہوئے

یا اوک سے پانی پیتے ہوئے
کاندھوں پر بادل دھرے
یا ہونٹوں میں پھول تھامے
کھلی چھت پر تاروں سے کھیلتے
یا لحاف میں منہ چھپائے
درختوں سے لپٹ کر
یا چاندنی اوڑھ کر
دن کے میدانوں میں
یا شام کی اوٹ سے
وہ ہواؤں کے رنگ دیکھتی ہے
اور میری راہ دیکھتی ہے
تعمیر سے انہدام تک
زمان و مکان کے درمیان
موجود سے معدوم تک
وہ میری راہ دیکھتی ہے
اور زمین
نیا آسمان اوڑھ لیتی ہے
پیڑ ـــــ پرندے تبدیل کر لیتے ہیں

چاند نئے پانیوں پر جھک جاتا ہے
اجنبی موسموں کی
ہوا چلتی ہے ——— راستوں میں
مٹی اڑتی ہے
اور بیٹھ جاتی ہے
وہ نیند میں چلتی ہے
اور مری راہ دیکھتی ہے
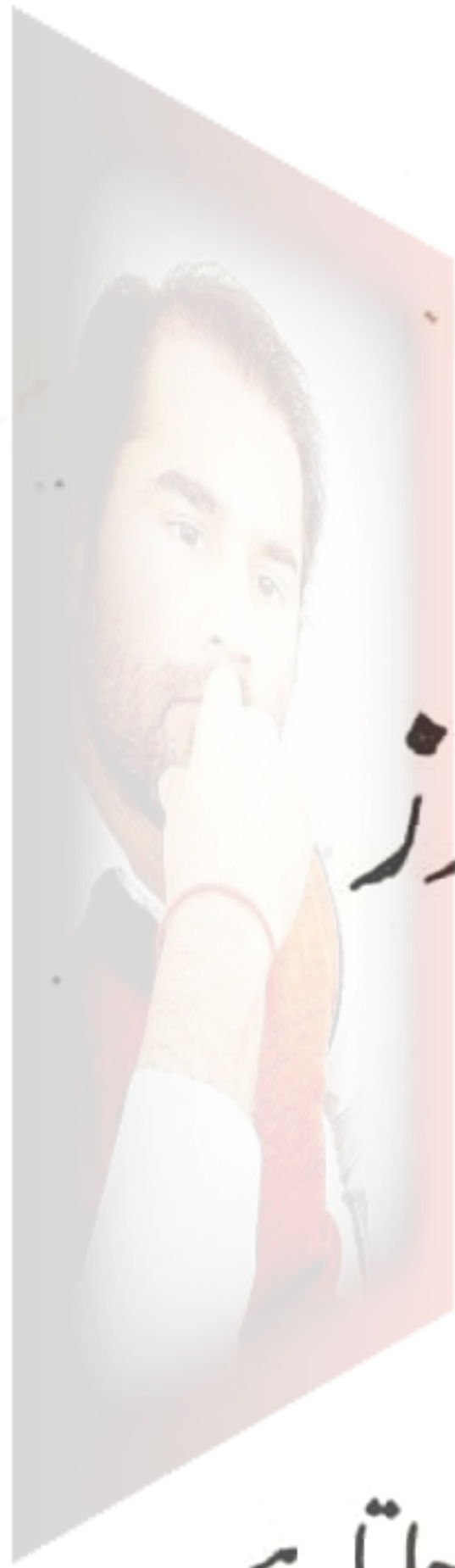
ہر روز کوئی قلم ٹوٹ جاتا ہے
کوئی آنکھ پتھرا جاتی ہے
کوئی روزن بجھ جاتا ہے
کوئی دہلیز اکھڑ جاتی ہے
کوئی سسکی جاگ اٹھتی ہے

کوئی ہاتھ ٹھنڈا ہو جاتا ہے
کوئی دیوار گر جاتی ہے
اور کوئی راستہ بن جاتا ہے

ہر روز کہیں کوئی چھت بیٹھ جاتی ہے
کوئی درخت کٹ جاتا ہے
کوئی خواب بکھر جاتا ہے
کوئی آہٹ رخصت ہو جاتی ہے
اور ایک آواز —— اپنی آمد کا
اعلان کر دیتی ہے
کوئی جنگل اُگ آتا ہے
اور ایک زمانہ معدوم ہو جاتا ہے

ہر روز کوئی نیند ٹوٹ جاتی ہے
کوئی آنکھ لگ جاتی ہے
کوئی دل بیٹھ جاتا ہے
اور کوئی زخم بھر جاتا ہے

ایک قصہ ادھورا رہ جاتا ہے
ہر قصے کی طرح
کوئی گیت سو جاتا ہے
کون تان الجھ جاتی ہے
کوئی سانس پھول جاتی ہے
اور خاموشی چھانے سے پہلے
کوئی دھن چھڑ جاتی ہے
انگلیاں چلتی رہتی ہیں
تار ٹوٹتے رہتے ہیں!



ہر روز کوئی بارش تھم جاتی ہے
کوئی زمین سوکھ جاتی ہے
کوئی چولھا سرد ہو جاتا ہے
کوئی بستی اجڑ جاتی ہے
—— کسی تعمیر کے نواح میں
کوئی خوشبو سو جاتی ہے
ایک دریا اپنا رخ تبدیل کر لیتا ہے

اور کناروں پر ایک آگ جل اٹھتی ہے

ہر روز کوئی پھول کھل اٹھتا ہے
کوئی ہوا چل پڑتی ہے
کوئی مٹی اڑ جاتی ہے
اڑ جاتی ہے اور بکھر جاتی ہے
ہونے کی لذت سے سرشار چہروں پر
کوئی کھڑکی بند ہو جاتی ہے
اور کوئی دروازہ کھل جاتا ہے
کھلا رہتا ہے دیر تک

کوئی پہیا رک جاتا ہے
کوئی سواری اتر جاتی ہے
کوئی پتّا ٹوٹ جاتا ہے
کوئی دھول بیٹھ جاتی ہے
اور ایک سفر تمام ہو جاتا ہے
شاخ جھول جاتی ہے
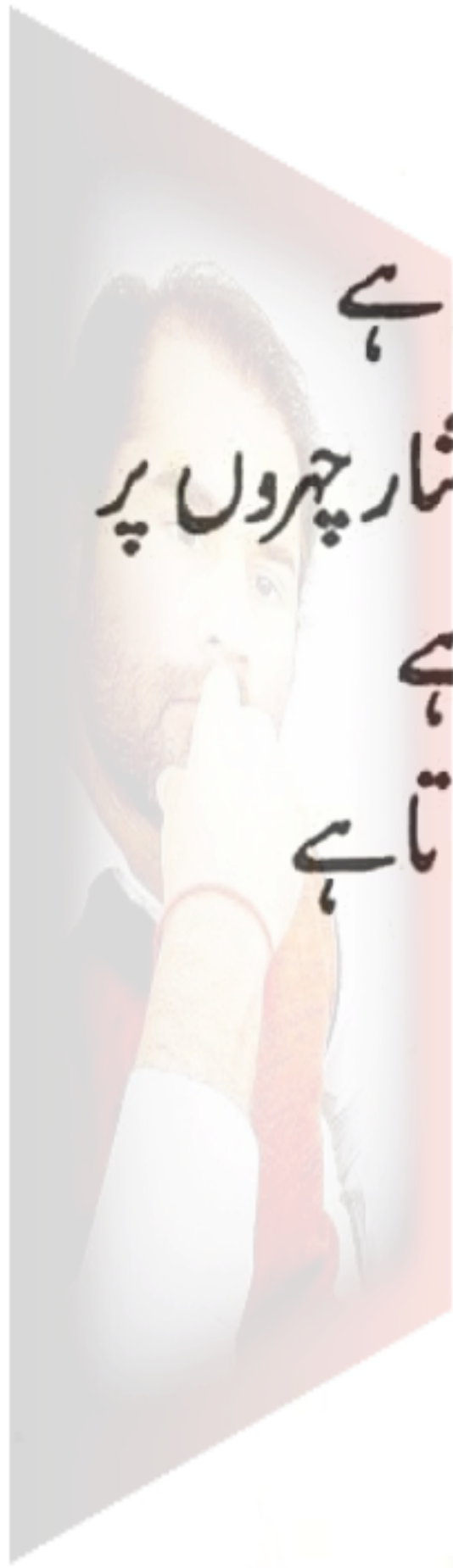
اور کوئی پرندہ اڑ جاتا ہے
ان دیکھی فضاؤں کی جانب
اجنبی گھٹاؤں کی جانب

ہر روز میری آنکھ سے، تمھارے لیے
ایک آنسو۔ گر جاتا ہے
ہونٹوں سے ایک دعا اتر جاتی ہے
دل میں ایک دھاگا ٹوٹ جاتا ہے

اور ایک دن۔ گزر جاتا ہے



دنوں پر دن گرتے چلے جاتے ہیں
گھاس پر سوکھے پتّوں کی طرح
مُٹھّی سے گرتی ریت کی طرح
گزرتے چلے جاتے ہیں
آنکھ سے گزرتے منظروں کی طرح
ہوا میں بہتے بادلوں کی طرح

اور ایک روز ———

موسم گدلا جائیں گے
چہرے ساکت ہو جائیں گے
شور تھم جائے گا
سارے دن
میرے اندر۔ غروب ہو جائیں گے

اور آتے ہوئے روز میں ———

ٹوٹا ہوا قلم
ایک نام کا دھبّا
اور کٹی ہوئی انگلیوں کے نشان رہ جائیں گے!

# میں گزرتا ہوں

برسوں کی دوری پر اطراف میں بارش
بھیگے ہوئے در و بام اور مکین
میں ان سے پوچھتا ہوں
میں ان کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں
اور پوچھتا ہوں
"میں کیا کروں؟"

وہ ہنستے ہیں
وہ میرے دل کو زخمی کرتے ہیں
اور قدموں سے
مسافت کی دعا باندھ دیتے ہیں
میں گزرتا ہوں
شاہراہوں اور شور سے
دھول بھری خاموشی کے ساتھ
دلوں اور دریچوں سے
مرجھائی نیند کے ہمراہ
قہقہوں اور آنسوؤں سے
ایک پتھریلی ہنسی کے ساتھ
میں گفتگو سے گزرتا ہوں
اور پھول میرے ہونٹوں پر خشک ہو جاتے ہیں
میں تیری آنکھوں سے گزرتا ہوں
پرچھائیں کی طرح
اور تیرے دل سے
بھولی بسری یاد کی صورت
میں ساحل کو دیکھتا ہوں

سمندر کی آنکھ سے
اور زندگی کو جانتا ہوں
مٹی کے حوالے سے
میں تجھے دیکھتا ہوں
اور گزر جاتا ہوں
میں دنیا سے ایسے گزرتا ہوں
جیسے کوئی نیند سے گزرتا ہے

# ہنوز نیند میں ہیں

تم ایک سیاہ گلاب کی طرح کھل اٹھتے ہو
اور تمہاری پتیاں
میرے دل کے آنگن میں
آہستگی سے گرتی رہتی ہیں
میری آنکھ ہی نہیں کھلتی
ریشمی نیندوں والی رات میں

تم ایک گھنے لمس کی صورت
میرے بستر میں گنگنانے لگتے ہو
اور میری آنکھ ہی نہیں کھلتی
عمر کی منڈیروں سے دن
پرندوں کی طرح
ایک ایک کر کے اڑ جاتے ہیں
اور ان کے گرے ہوئے پروں کے ساتھ
ہوا کھیلتی رہتی ہے
وقت اپنا کاہل ماتھا دیواروں سے ملتا رہ جاتا ہے
گلیاں اور مکان
موسموں اور چہروں سے بھر جاتے ہیں
میدانوں میں ہوا سیٹیاں بجاتی ہے
ایک ہاتھ ——
تمہاری لرزتی ہوئی شاخ پر جھک جاتا ہے
بادل، زمین کا ماتھا چوم کر
رو دیتے ہیں
آوازوں کا سیل
میری کنپٹیوں سے ٹکراتا ہے
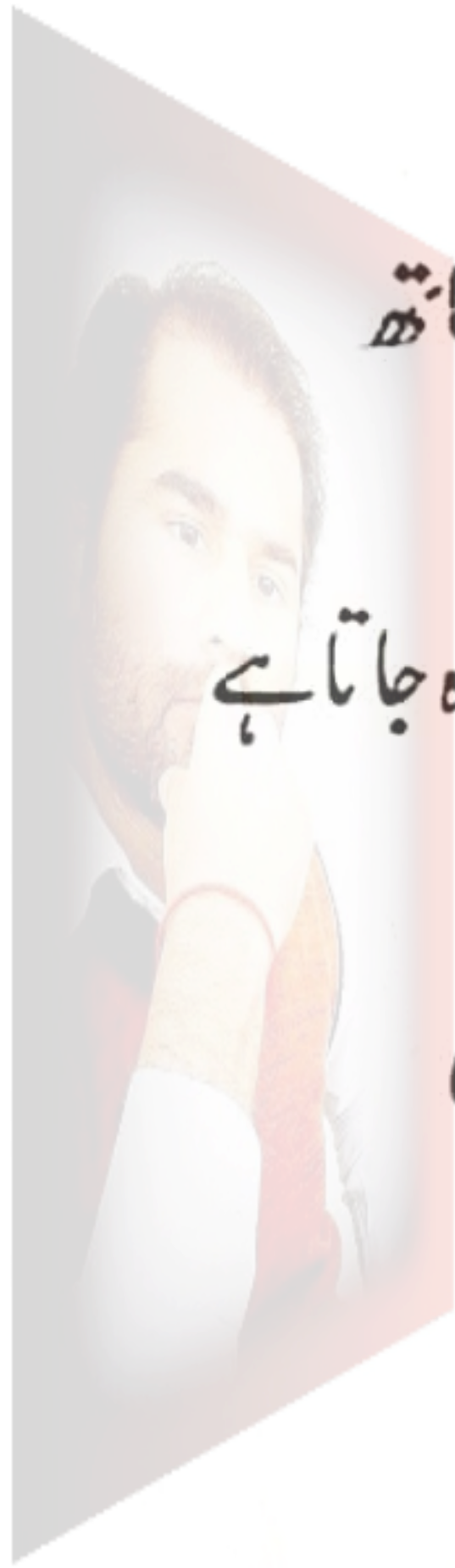
پلکوں پر دنوں کا نم
بوندوں کی طرح برسنے لگتا ہے
دوریوں کی اوٹ سے
تم، میری جانب دیکھتے ہو
موسموں کی گھنی ردائیں لپٹی ہوئی
اپنی مخروطی انگلیاں
تم، میرے سینے میں گاڑ دیتے ہو
اور میری آنکھ ہی نہیں کھلتی
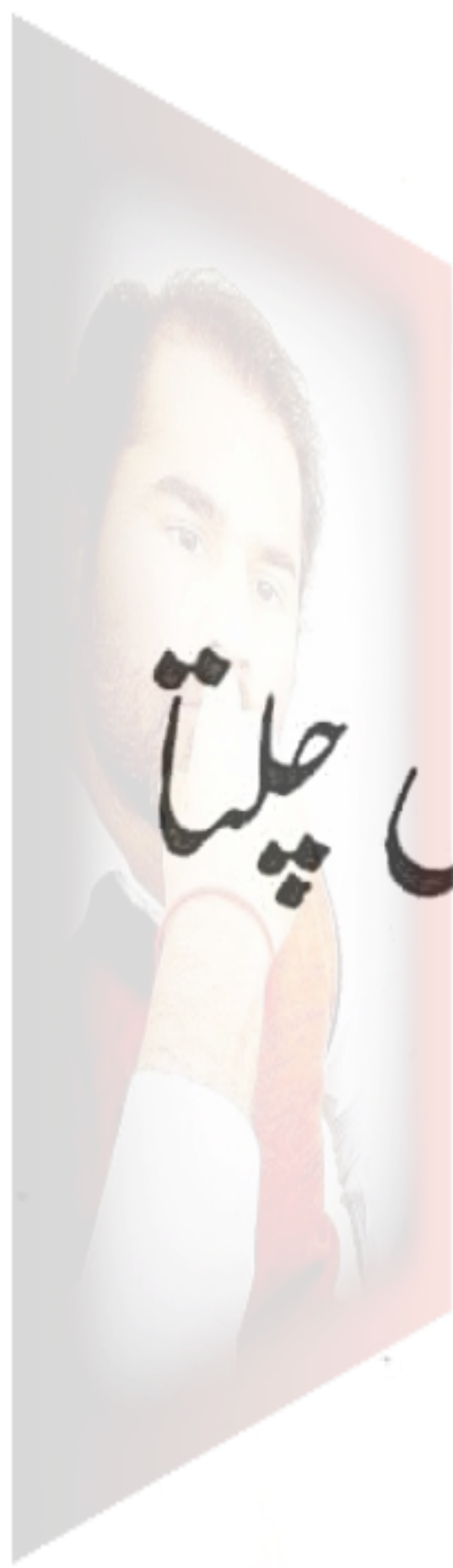
# کچھ پتا نہیں چلتا

آبائی شہر کو جاتی گاڑی کو
دیکھتا ہوں
اس میں سوار نہیں ہوتا
اور نہ ہی ہاتھ ہلاتا ہوں
دنیا۔ عجیب و غریب لوگوں
اور چیزوں سے بھری پڑی ہے

میں بھی بچتا بچاتا
ان میں سے گزرتا ہوں
بغیر کسی یادداشت کے
بغیر کسی خواب کے

ایک دھند ہے
جو دماغ پر جم گئی ہے
ایک رفتار ہے
جو کچھ دیکھنے نہیں دیتی
خالی جگہیں پُر نہیں ہوتیں
لیکن بادل دوڑتے چلے جاتے ہیں
پتھروں اور دیواروں کے درمیان
ہم ——— سایوں کی طرح
بھٹکتے پھرتے ہیں

دن ہے یا رات
جیت ہے یا ہار
سفر ہے یا قیام
کچھ پتا نہیں چلتا
بس یوں ہے
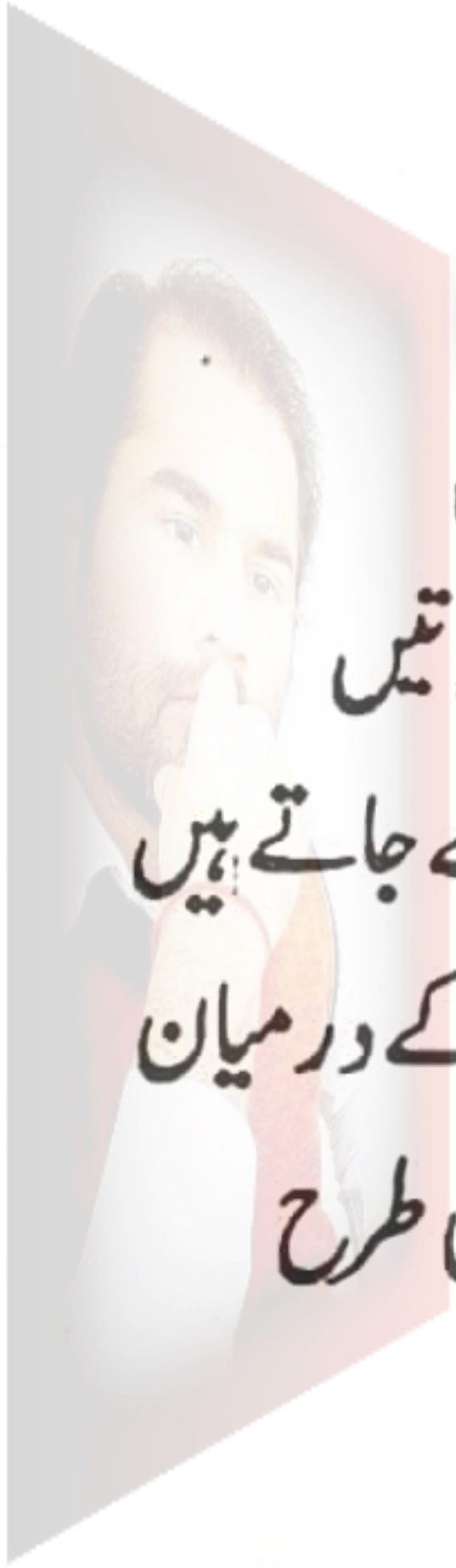
کہ جب میرے پاؤں کو ٹھوکر لگتی ہے
یا میرا ماتھا
اچانک۔ کسی دیوار سے جا ٹکراتا ہے
مجھے لگتا ہے
جیسے کوئی کہتا ہو
"بیٹے —— میرے بیٹے ——!"

# نظم

موسم سرما کی پہلی شام
نیند اور نورستنگی کی خوشبو میں سوئی ہوئی
گھاس پر۔ دو اجلے قدم
دو نم ناک آنکھیں
اندھیرے میں راستہ بناتی ہوئیں
درختوں میں بھٹکنے لگ جاتی ہیں

چراغ سے زمین کے کناروں تک جل اٹھتے ہیں
دو بازو آسمان کے پہلوؤں تک پھیل جاتے ہیں
اور ایک ہارا ہوا دل
جگہوں کے خالی پن کو
اور بوجھل کر دیتا ہے ——

ایسے میں
کوئی پہیّا سا آپ کے اندر گھوم جاتا ہے
کوئی قدم آپ کے دل پر
عین اس جگہ آ پڑتا ہے
جہاں پہلے سے موجود ایک گھاؤ
اس کا منتظر ہوتا ہے



میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ
دن اور رات کے اس تنے ہوئے رسّے پر
کسی کو نیند میں چلتے ہوئے
اپنی جانب آتے —— دیکھ لیا ہے
اور اب میرے دل میں ایک جنگل جھومتا ہے

ہوائیں شور کرتی ہیں
مٹی اڑتی ہے، ہر جانب
میری نیند ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے
ایک زیادہ گہری نیند کو —— راستہ دینے کے لیے
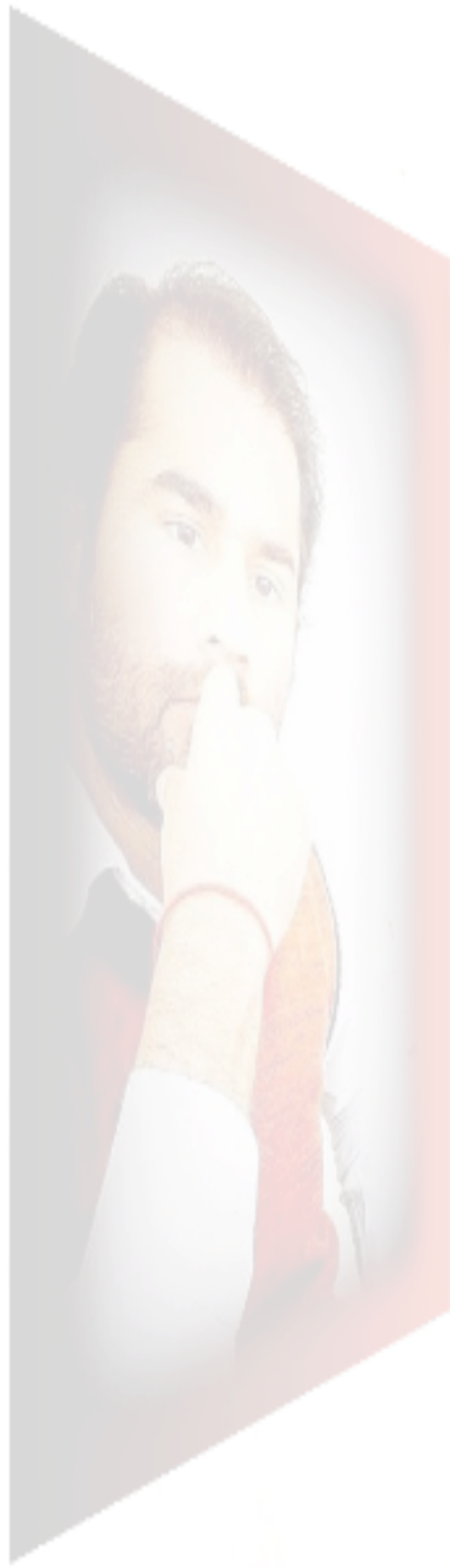
# موت مجھے بُلاتی ہے



موت مجھے بلاتی ہے
لیکن مجھے وہ شام بھولتی ہی نہیں
جب درختوں میں ہوا اچل رہی تھی
میں رک گیا تھا
ایک منظر کے سامنے
گزر جانے کے لیے

اپنی مٹی اور بادلوں کے درمیان
وقت کے بہاؤ کے عین وسط سے
نکل جانے کے لیے
آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے
تم میرے دل سے گزرے تھے
یا شاید میں تمھارے دل سے
اور چاندنی ہماری انگلیوں سے الجھ رہی تھی
زمین پر ایسی شام
شاید ہی کہیں اتری ہو
کیفے کی باڑ سے
دنیا ہمیں دیکھتی تھی
پاس بلاتی تھی
اور ہم لوگ لوٹ گئے تھے —— اپنے اپنے جہنم کو
اذیت اور انکار کی ہر رات
اس شام کی امان میں ہے
وقت کم ہے یا زیادہ
کچھ پتہ نہیں چلتا
میں ایک خواب سے دوسرے خواب میں
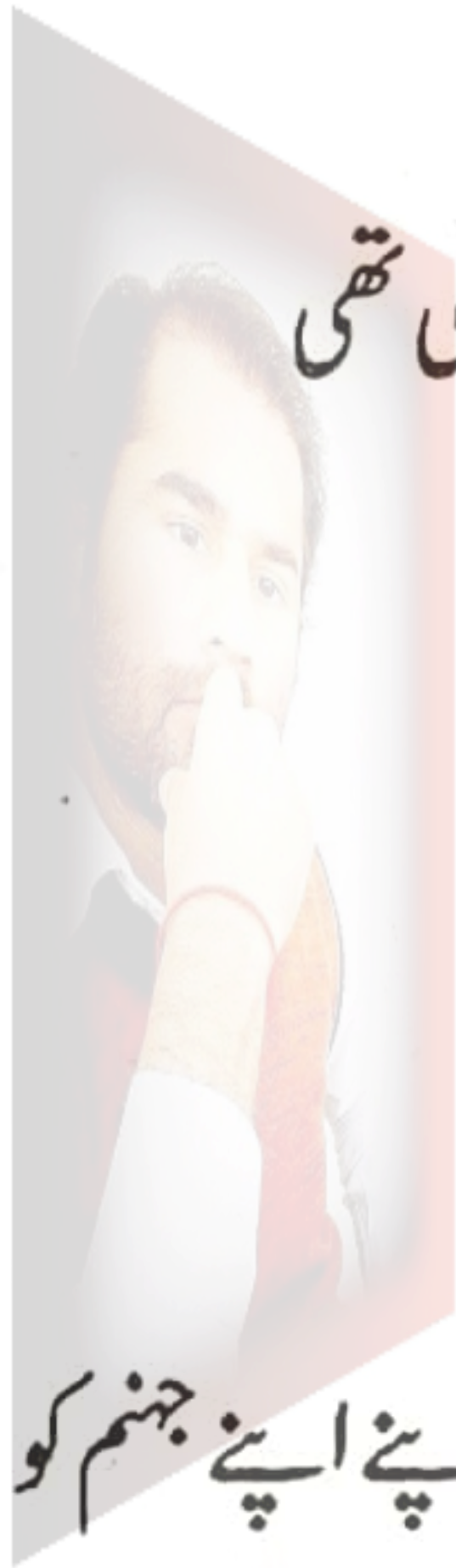
اس شام سے گزر کر جانا چاہتا ہوں
تم کہاں ہو؟
موت۔ مجھے بلاتی ہے

## اگر مجھے
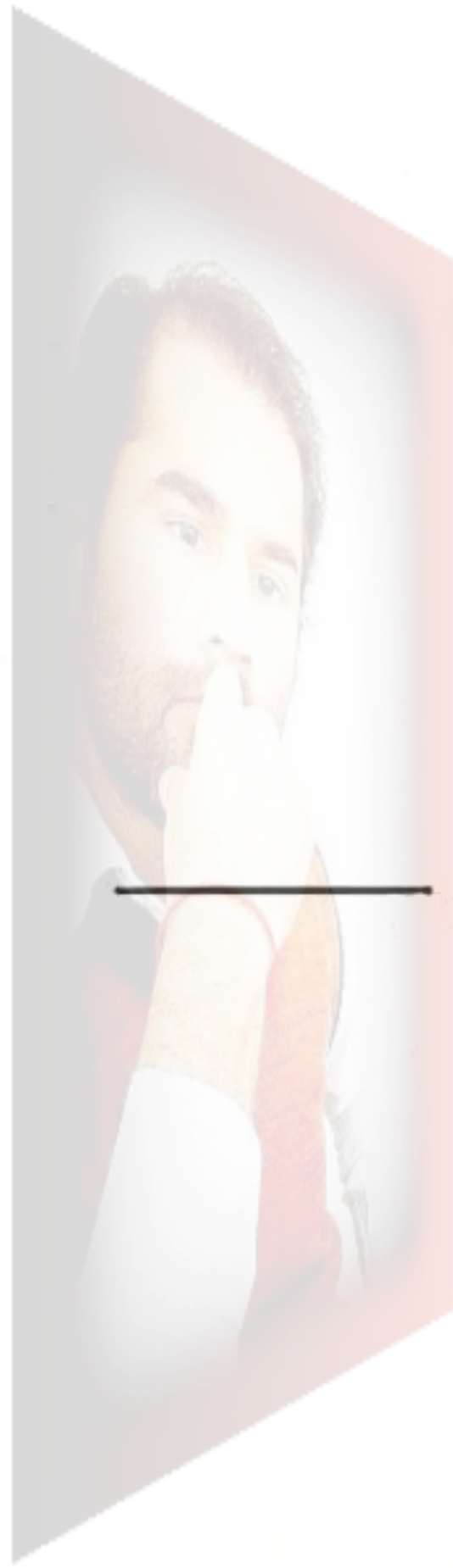
اگر مجھے خواب ہی دیکھنا تھے
تو میں خواب دیکھتا
آزادی اور محبت کی سمت کھلنے والی کھڑکیوں
اور کشادہ آنگنوں کے
میں نے کیوں
بند دروازوں کے خواب دیکھے

اگر مجھے جاگنا ہی تھا
تو میں جاگ اٹھتا
کسی بادلوں بھری صبح میں
تمھارا ہاتھ تھامے ہوئے
میں نے کیوں
شک اور دکھ سے بھرے
اس گھر میں آنکھ کھول دی

اگر مجھے بکھرنا ہی تھا
تو میں بکھرتا
سمندر کے سینے پر
یا پھر تمھارے قدموں میں
میں نے کیوں
ان بے اماں راستوں میں
اپنی مٹی خراب کی ——؟

اگر مجھے انتظار ہی کرنا تھا
تو میں انتظار کرتا
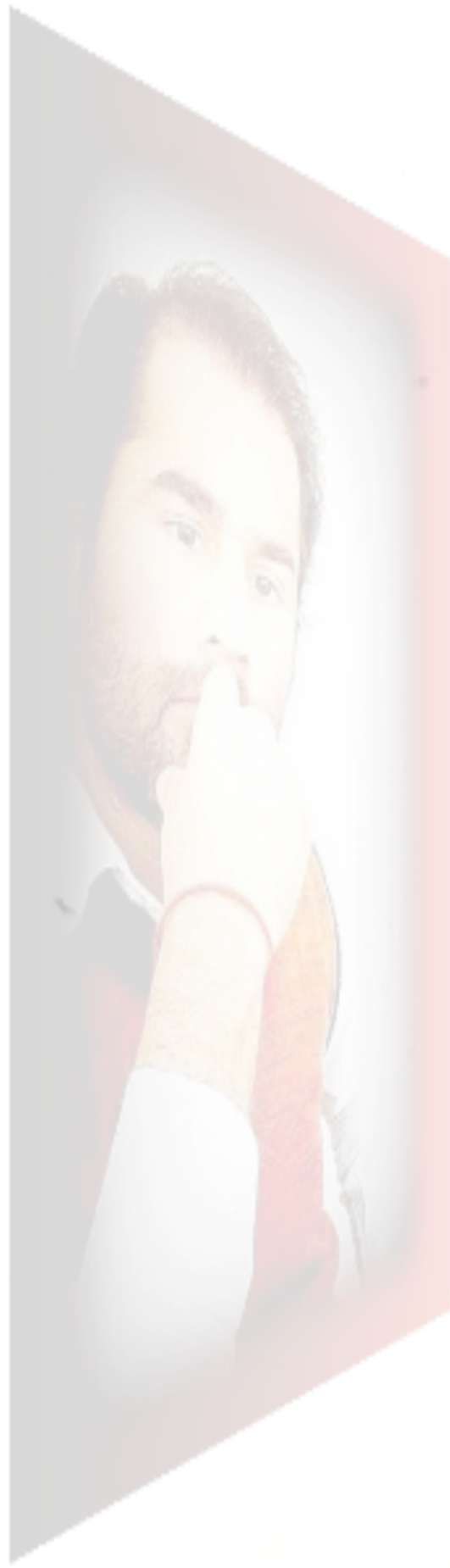
اس کا۔ جو راستے ڈھونڈتا
میری طرف آنے کے
میں کیوں آنکھوں میں چراغ لیے
اس رہگزار پر بیٹھا رہا
جہاں سے کوئی نہیں گزرتا؟

اگر مجھے دوڑنا ہی تھا
تو میں دوڑتا چلا جاتا
کسی بھی ناہموار سڑک پر
آنکھیں بند کیے ہوئے
میں کیوں ان دیکھے بھالے راستوں پر
ٹھوکریں کھاتا پھرا

اگر مجھے رکنا ہی تھا
تو میں رک جاتا
کسی بھی جھیل کے کنارے
اجنبی آسمان کے نیچے
میں کیوں بیٹھ گیا

## دنوں کی بے کیفی اور اکتاہٹ کی دہلیز پر

اگر مجھے سونا ہی تھا
تو میں سو رہتا یہیں کہیں
اس بستر پر
یا اپنے مضافات میں کہیں
میں کیوں سو گیا
بے خوابی اور اذیت کے پتھر پر
سر رکھ کر ——
اور
اگر مجھے اتنے بہت سے کام کرنا ہی تھے
تو میں اس دوڑ میں بھی شامل ہو جاتا —— دوسروں کے ساتھ
یا پھر —— دیواروں سے ہی ٹکرا جاتا
انہیں توڑتے ہوئے!
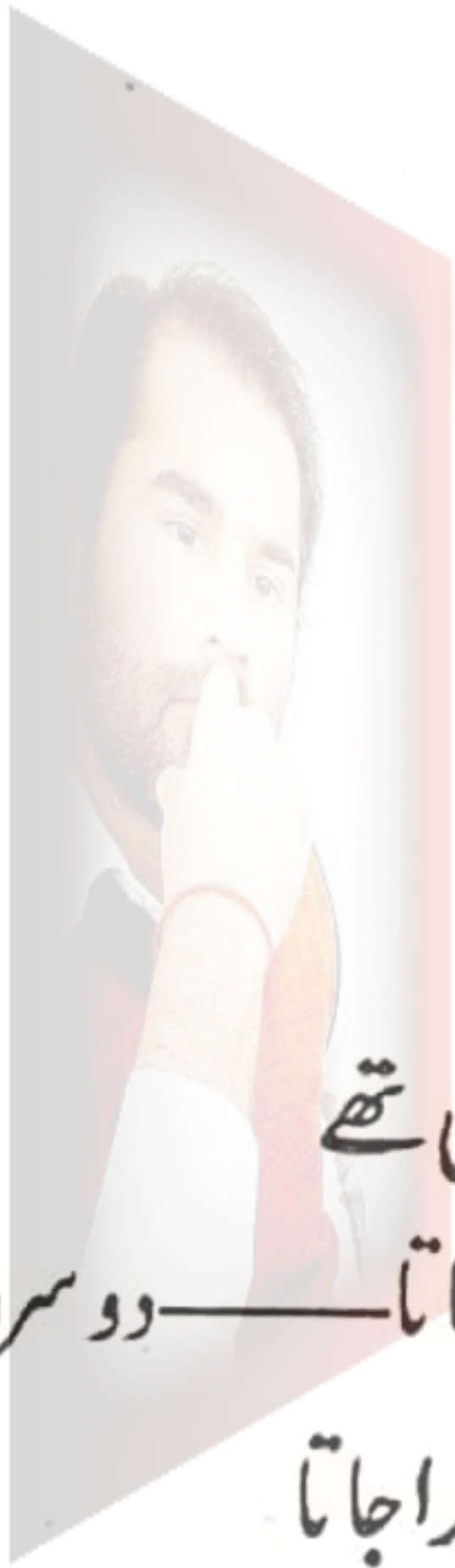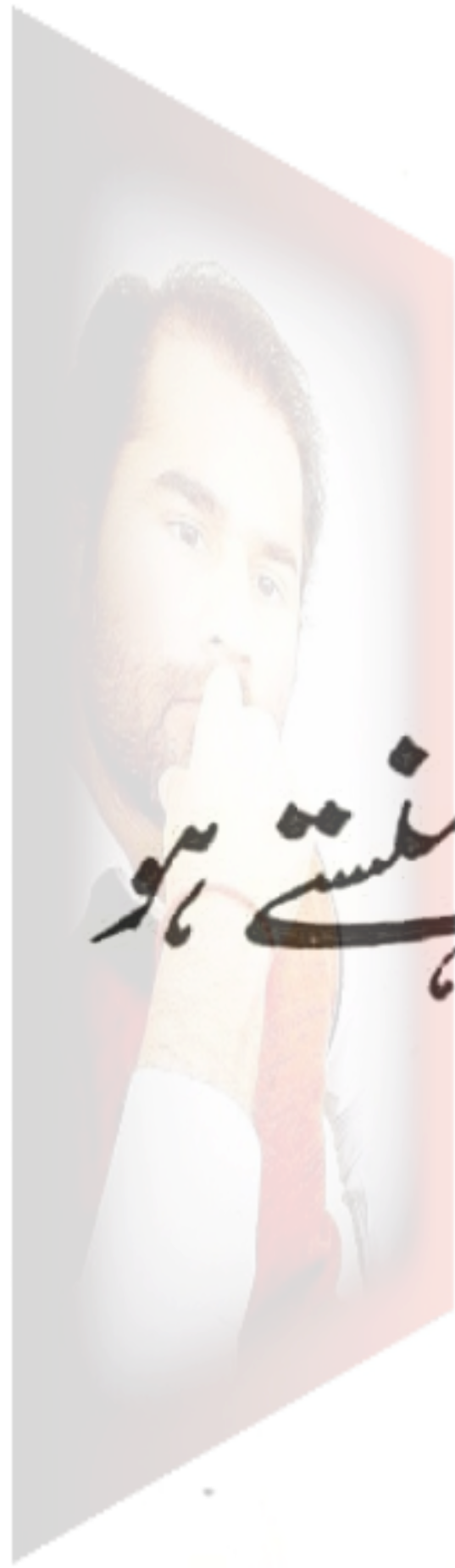
# تم ہنستے ہو

تم ہماری دنیا کو دیکھتے ہو
اور ہنستے ہو ——
تمہارے چہرے پر آسودگی ہے
اور سیرابی ——
بہت دنوں کے بعد ایک اجلا دن نکلا ہے
اس دن کے عین وسط میں

تم ـــــ سر کو پیچھے کی جانب پھینکتے ہو

اور ہنستے ہو

تم ہنسی سے کچھ زیادہ ہنستے ہو

سب تمھیں دیکھتے ہیں

پتے تالیاں بجاتے ہیں

ہوا جھوم جھوم چلتی ہے

بادل ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے

آدمی کو توفیق ملے

تو اسے ہنس لینا چاہیے

میرے دل میں بھی جب کوئی سورج اترتا ہے

تو میں بھی ہنستا ہوں

لیکن تمھیں اچھا نہیں لگتا

تمھارے چہرے پر

ملامت اور تاریکی چھا جاتی ہے

کیا میں ہنستا ہوا۔ اچھا نہیں لگتا؟

تم ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہو

میرا خیال ہے

دوسروں کی ساری ہنسی بھی

ہمیں۔ ہنس لینی چاہیے

# نظم

میں۔ اذیت سے آنسو کشید کرتا ہوں
اور اپنی ہزیمت کے زخم کو
یادوں اور خوابوں کی
ٹوٹی ہوئی انگلیوں سے چھیڑتا رہتا ہوں
داغ مجھے روشنی دکھاتے ہیں
موجود کے دھوئیں سے

میں نے اپنی آنکھیں بھرلی ہیں
اور کچھ دیکھنا نہیں چاہتا
علم۔ بوسیدہ کاغذوں کی صورت
میرے سینے میں اڑتا رہتا ہے
اور دانائی
معمولی آدمی کی پیشانی سے گرتی ہوئی
میرے میلے لباس سے لپٹ جاتی ہے
میں، دیوار کی طرح
اپنی کائی سے کام رکھتا ہوں
اذیت کوشی اور تذلیل نے
میرے دماغ کو ماتھا بنا دیا ہے
اتنا ترس کھا چکا ہوں
کہ میرا جسم بھر گیا ہے
میری نفرت کی گرفت میں
موسموں کے سانس اکھڑ گئے ہیں
میں نے اپنے پانو توڑ لیے ہیں
اور اپنے ہی سائے پر بیٹھ گیا ہوں
اور۔ دنوں کے ملبے سے
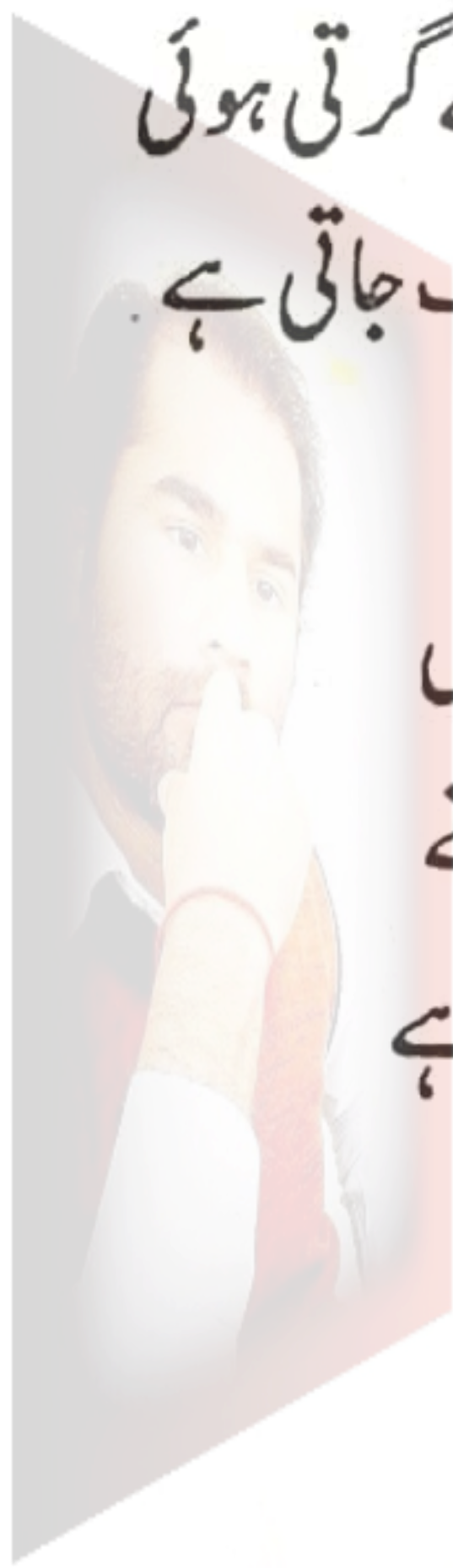
ٹوٹے کھلونے اور منہدم زمانے اٹھاتے ہوئے
آتی جاتی ہوا کو
گالیاں دیتا رہتا ہوں
ایک پاگل شور
میرے تعاقب میں ہانپتا چلا آرہا ہے
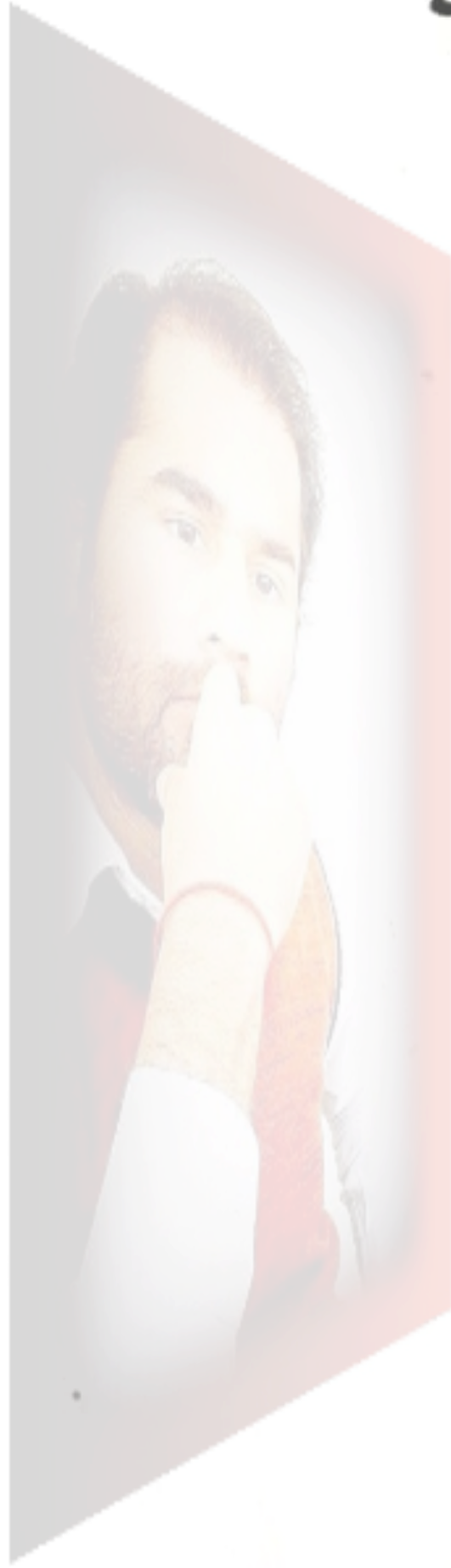
# نیندوں کے ملبے پر
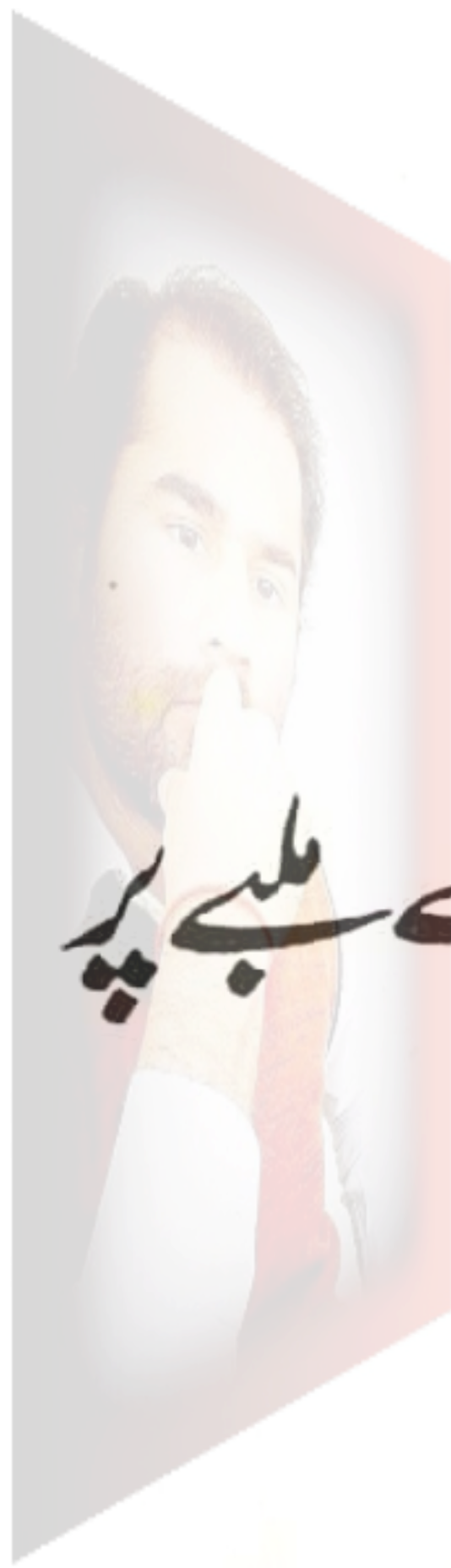
اور پھر یوں ہوتا ہے
بارش کے پہلے قطرے
چہرے پر گر جاتے ہیں
کھلی چھتوں پر
رات کی تھکاوٹ سے بوجھل چارپائیاں
رسیوں سے باندھ کر

صحنوں میں اتاری جاتی ہیں
کنپٹی پر، آوازوں کی دستک جاگتی ہے
باورچی خانے میں ناشتے کی خوشبو
اور چولھے کی تپش سے دہکتے ہوئے چہرے
اور ماں کا بوسہ ——
باپ کی آواز
تلاوت کرتی ہوئی
سکول تک چھوڑنے آتی ہے
اور تختہ سیاہ پر چاک
عمروں کا حساب کتاب کھینچنے لگ جاتا ہے
تفریح کا وقفہ
ہاتھاپائی۔ اور چھابڑی والوں کی آوازیں
تختیوں پر گاچنی ملتے ہوئے
اچھے بچے بننے کی کوشش
ٹاٹ سے اڑتی گرد
اور پھٹے ہوئے قاعدوں میں
دن۔ ڈوب جاتا ہے
ہم لوٹتے ہیں
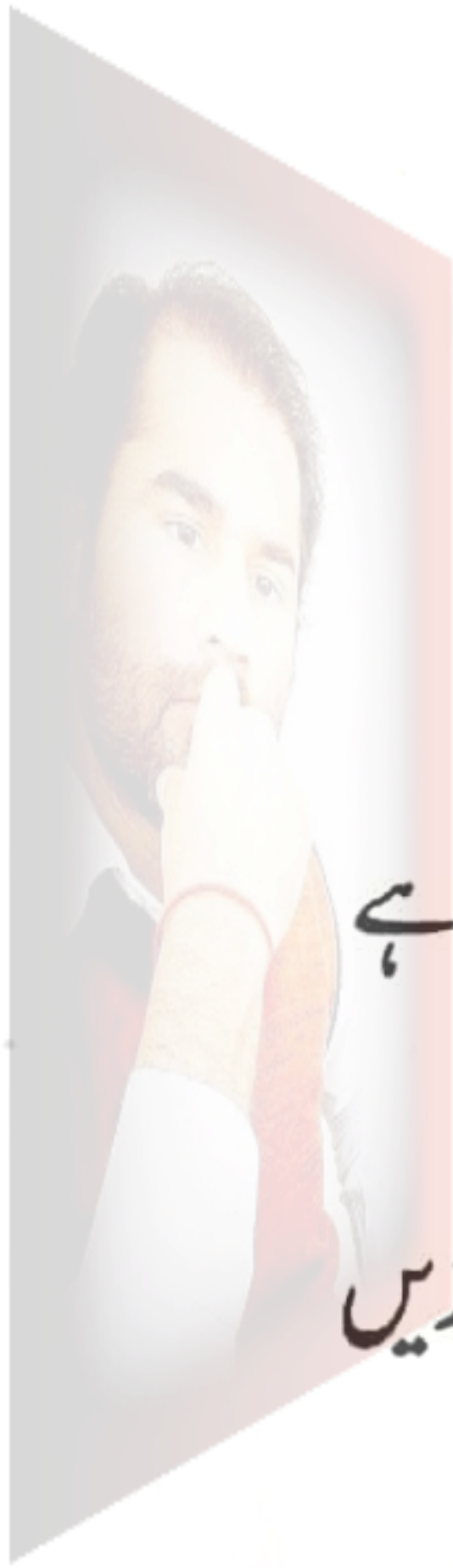
اور شام کا لحاف، منہ پر ڈالے

باہر نکل جاتے ہیں

بجھے ہوئے سویروں کی راکھ اڑاتی ہوا

ہر سمت۔ سنسناتی ہے

آبادی سے پرے

ریلوے لائن پر چلتے ہوئے

دونوں طرف خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں سے اٹھتے

دھوئیں کو آنکھوں میں بھرتے ہوئے

ہمارے قدم تیز ہو جاتے ہیں

کانٹے۔ بدل جاتے ہیں

ہم کتنی دور نکل آئے ہیں

سروں پر غیر محفوظ رات چلاتی ہے

اور حافظے کے پچھواڑے

نیندوں کے ملبے پر

عمروں کی بے خوابی سے ٹوٹی ہوئی

چارپائیاں اوندھی پڑی ہیں

# خود کلامی

(۱)

تم نے ٹھیک سمجھا
ہر تعلق، ایک ذلت آمیز معاہدہ ہے
تھکے ہارے دلوں کا، اپنے ارادوں کے ساتھ
ہر ربط، ایک مسلسل فریب
ہر لمس، ایک رائیگاں سچائی
جس میں سہمے ہوئے جھوٹ سے

ہماری پوریں پناہ مانگتی ہیں
ہاں۔ فراق ایک ابد ہے
تیرے میرے زمانوں کا آخری علاقہ
تیرے میرے امکانات کی آخری سانس
تم نے ٹھیک سمجھا
زندگی، پانیوں میں تیرتے ہوئے جزیرے پر
خودرو گھاس کی طرح
بے معنی اور خوبصورت ہے
تم نے ٹھیک سمجھا
وقت، دلوں سے لپٹ کر
آس اور نراس کا ایک ایک قطرہ نچوڑ ڈالتا ہے
وقت۔ ایک بھاری جاذب ہے
جس میں، میں اور تو
بوندوں کی طرح گرتے رہتے ہیں
تو اور میں
ازل سے ابد تک چلنے والے
ایک مسلسل واہمے کے خال و خد
بوجھل پلکوں سے اس پار کے اندھیارے کو جھٹکتے ہوئے
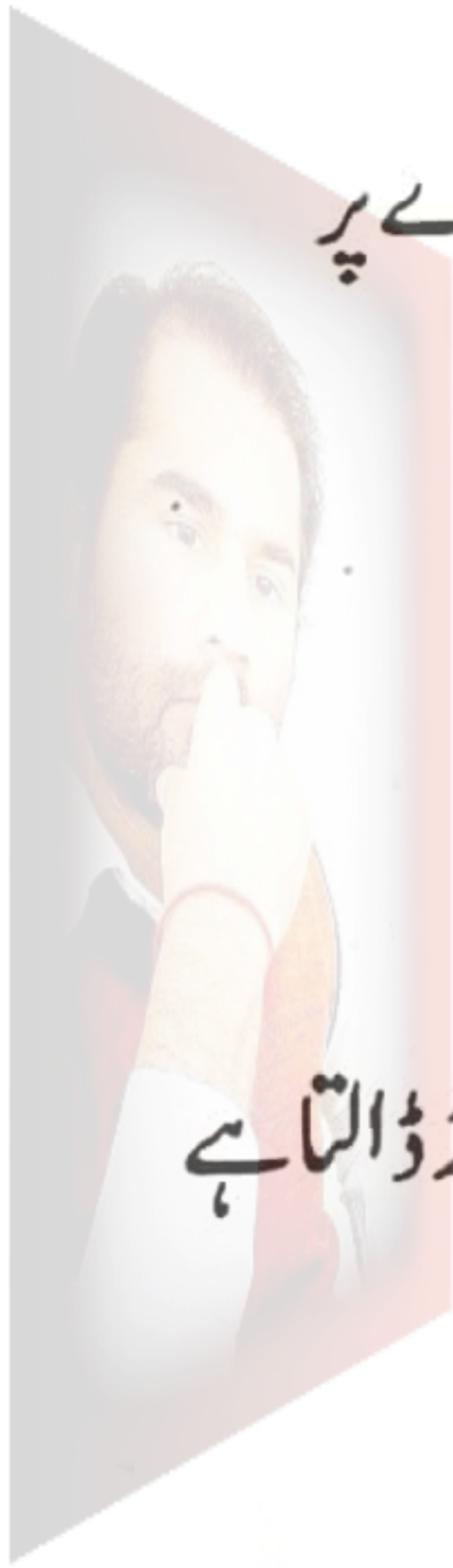
ایک دوجے کو
صدیوں سے گھورتے چلے آرہے ہیں
تم نے ٹھیک سمجھا
کہ نیند، بے پناہ آغوش کا لمس
کہ رات، سب وقتوں کی ایک سچائی
اور صبح کی مقدس روشنی
اس سکوت میں چلنے والے، ایک لمحے کی کروٹ
اس سناٹے میں دراڑ
جو زمان و مکان پر چھائے ہوئے گھنے ابر کی چادر ہے
جس سے ہمارے ناموں کی ڈوریاں بندھی ہیں
ہاں۔ لمحہ صدیوں پر بھاری ہوتا ہے
لمحہ، جو تیری میری آنکھوں کے کھلنے کا جواز ہے
لمحہ، جو عافیت کی بے خودی میں سرشار،
ایک مسلسل رقص ہے
لمحہ، جو تو ہے
لمحہ جو میں ہوں
تم نے ٹھیک سمجھا
کہ سمجھ لینے میں

کبھی نہ ہونے کا خوف ہی ہمارا رشتہ ہے:
جو کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے

# داستان

"قبروں پر دیے بجھ گئے ہیں
اور درختوں میں
ستارے ٹوٹ رہے ہیں
بوسیدہ کواڑوں پر
خاموشی دستک دیتی ہے
اداسی اور محبت سے بوجھل ہوا

سیٹیاں بجاتی ہوئی
زمانوں سے گزر رہی ہے
ان گنت ہاتھ چہار جانب پھیلے ہوئے ہیں
کیلنڈر سے سال
دنوں کی طرح اتر رہے ہیں
آنگنوں میں چارپائیاں اوندھی پڑی ہیں
اور چولھوں میں راکھ
سرد ہو چکی ہے
بچوں کی آنکھوں میں
کھلونے ٹوٹ گئے ہیں
اور دکھتی چھاتیوں میں
شہد خشک ہو گیا ہے
اکھڑتی ہوئی سڑکوں پر
ماتمی جلوس آواز لگاتا ہے
اور، ڈھولک کی تھاپ پر
لڑکیاں وداع کے گیت گا رہی ہیں
نیند کی مہک میں لپٹی ہوئی عمارتوں میں
سانسیں رینگ رہی ہیں
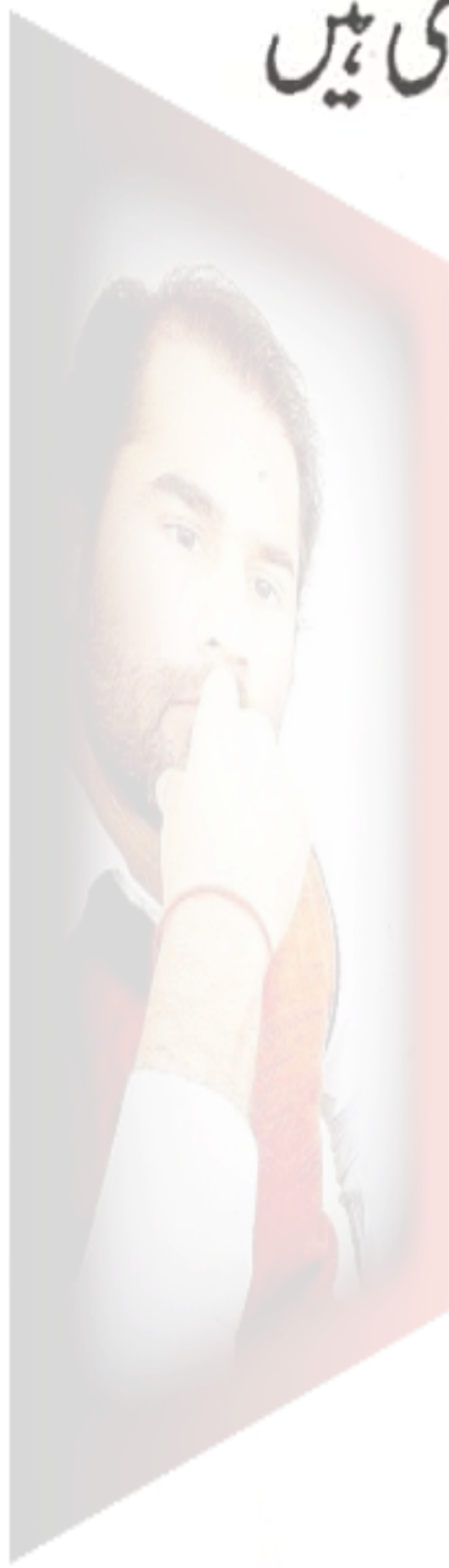
دریچوں میں چاند
تھک کر سو گیا ہے
رات کے کیچڑ میں لت پت گلیاں
جاگ رہی ہیں
وہ سامنے
گلی کے موڑ پر
کانپتے لیمپ کی زرد روشنی میں
ایک سایہ ـــــــ "

کیا تمہیں نیند آ گئی ہے؟

# صحرا پیاسے نہیں

نہیں داخل ہو سکتے تم
کسی بھی مکان میں
مکین کی اجازت کے بغیر
اور ہاتھ نہیں ملا سکتے کسی سے
جب تک وہ خالی اور گرم نہ ہوں
پھر نہیں سکتے

رات دن کے علاقے میں
کوتوال کی اونگھ کے بغیر
چیخ نہیں سکتے
لوگوں کی محفوظ خاموشیوں کے درمیان
اور آنسو نہیں بہا سکتے
کھلے دہانوں کے شور کے بیچ
نہیں کر سکتے نفرت
جب تک تمھارے بازو، مضبوط
اور ارادے
اندھیرے سے بڑھ کر سنگین نہ ہوں
لوٹ نہیں سکتے تم گزشتہ کی جانب
دنوں کی بھیڑ میں راستہ بناتے ہوئے
اور موجود کے ہاتھ جھٹک کر
آئندہ سے بغل گیر نہیں ہو سکتے
تم چوم نہیں سکتے کسی کی آنکھوں کو
نیندوں سے پوچھے بغیر
اور سو نہیں سکتے کسی کے بستر میں
سلوٹوں کی مزاحمت کے بغیر
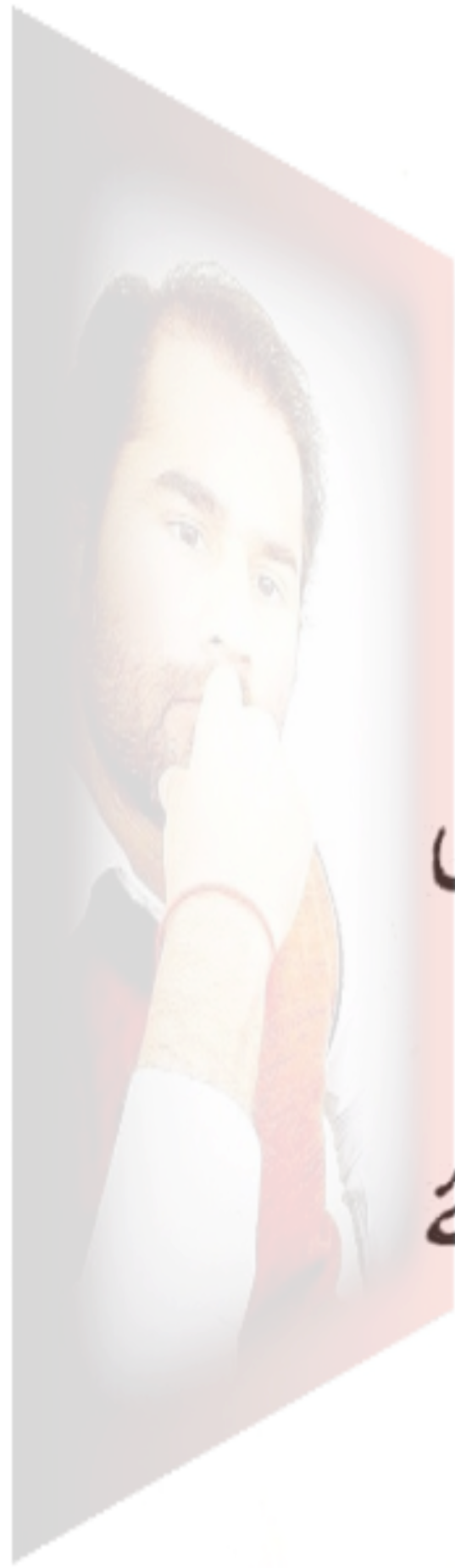
کر نہیں سکتے تم کارِ معاش
ذلت اٹھائے بغیر
اور مر نہیں سکتے
موت کے آ جانے سے پہلے
تمھارے بادلوں کے لیے
صحرا۔ پیاسے نہیں ہیں
اس آسمان کے نیچے
آزار کے بغیر
تم۔ محبت بھی نہیں کر سکتے

# خود کلامی
(۲)

تم نے کبھی سنی
وہ چپ
جو آوازوں کو لپیٹ لیتی ہے
وہ آواز جو درختوں میں گم ہو جاتی ہے
اور وہ چاپ
جو خاک میں مل جاتی ہے

تم کبھی گزرے
اس دن سے
جو نیندوں میں جاگ اٹھتا ہے
اس رات سے
جو کبھی نہیں گزرتی
اس شہر سے
جس کی کوئی حد نہیں
اس ساحل سے
جو لہروں میں اتر جاتا ہے
اور اس آنکھ سے
جو بجھ ہو جاتی ہے
تم نے کبھی سوچا
ان ہونٹوں کے لیے
جن سے نام گر جاتے ہیں
ان قدموں کے لیے
جن سے منزلیں تھکان بن کر لپٹ جاتی ہیں
ان آ نگنوں کے لیے
جنہیں ہم۔ اپنی عمروں کے ساتھ
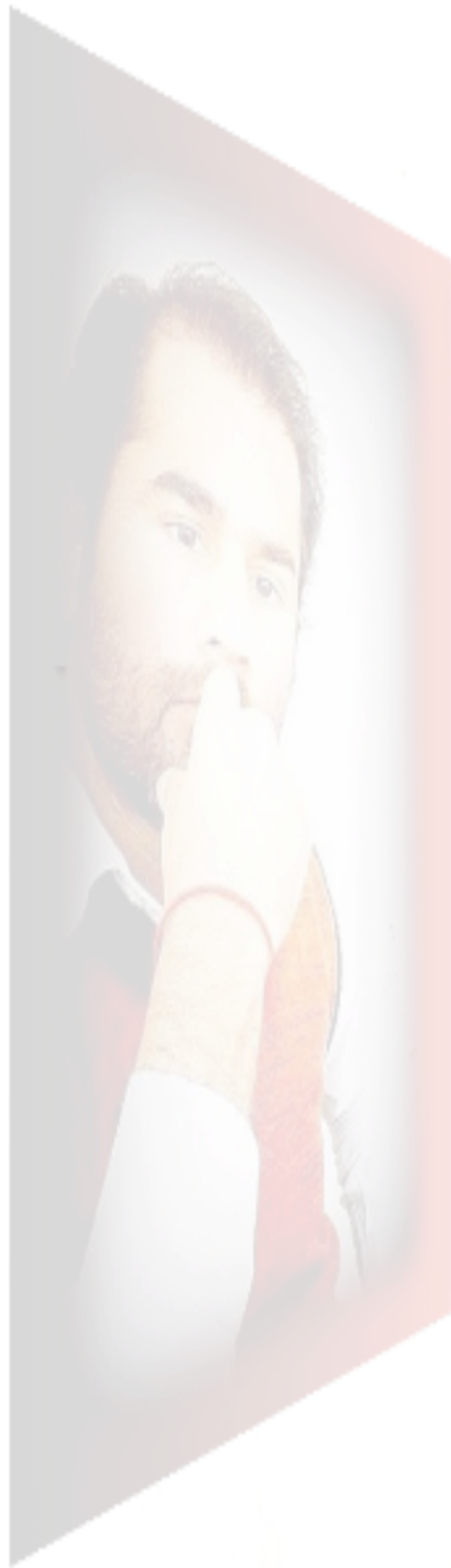
ترک کردیتے ہیں
تم نے کبھی سوچا
ان جسموں کے لیے جن کی کوئی توجیہہ نہیں
جنہیں وقت ادھیڑ ڈالتا ہے
ان بادلوں کے لیے
جو بے نشاں گزر جاتے ہیں
ان صبحوں کے لیے
جنہیں خوابوں کی دھند لاہٹیں
بوجھل کردیتی ہیں
ان ناموں کے لیے
جو ان جانی بارشوں میں بھیگ جاتے ہیں
اس ماحصل کے لیے
تم نے کبھی سوچا؟
کبھی احتجاج کیا؟
ہم ——
ہم تو بس، چپ ہو جاتے ہیں
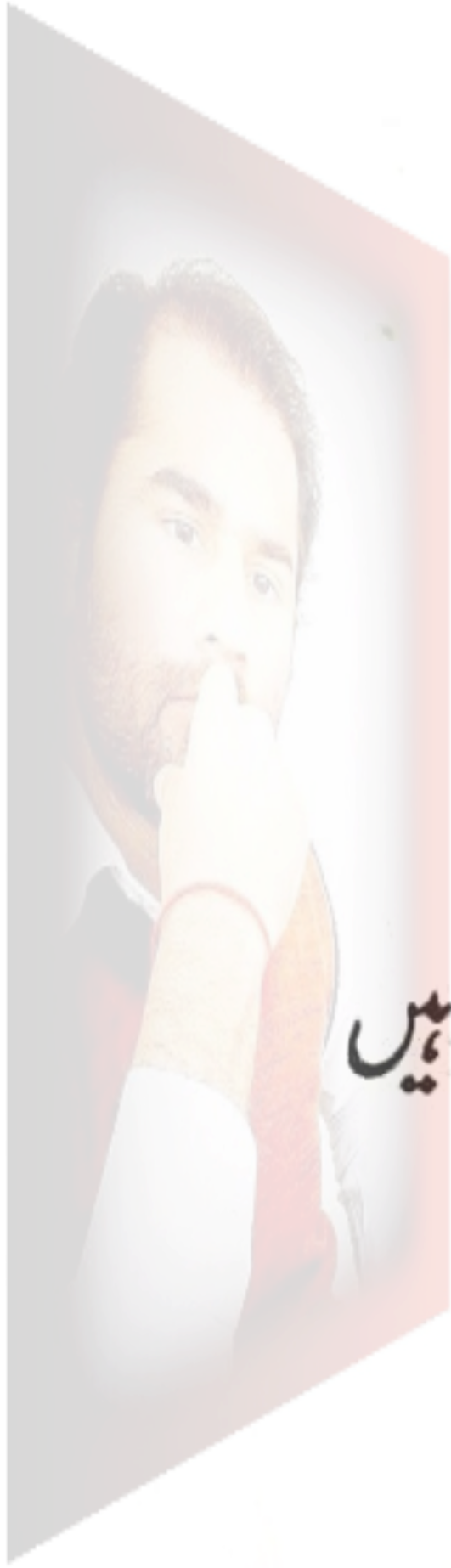
# وِچ مرزا یار پھرے

لکھ۔ نیند نہیں آتی
اور خواب نظر آتے ہیں
کروٹ لیں تو عمریں ٹوٹ جاتی ہیں
بارشوں میں بھیگے ہوئے دل، نچڑ جاتے ہیں
اور وقت کی دلدل میں
دنیائیں ڈوب جاتی ہیں

لکھ۔

موت کے پچھواڑے سے شہر آواز دیتا ہے

سڑکیں اکھڑ رہی ہیں

اور غلیظ پانیوں میں سانپ بہہ رہے ہیں

مغلظات میں لفظوں کی تہذیب ہے

اور تہذیب میں، سورماؤں کا نطفہ ہے

جابر پٹھوں کا تناؤ ہے

متلی سے عالم کو ثبات ہے

لکھ۔

آنکھیں پھیلی ہوئی پتلیوں میں

منظر انڈیل رہی ہیں

لوگ مر جاتے ہیں

اور ان کے گلے سڑے جسموں سے دھرتی جھومتی ہے

لاشوں کی ہمسائیگی میں

ان کی بند آنکھوں

اور نکلی ہوئی زبانوں سے گرتی رطوبت کے

زہر آلود چھینٹوں میں

پاگل کر دینے والی وحشی صداؤں کا گرداب ہوتا ہے

لکھ،

کھلے دہانوں میں جہنم کی آگ ہے
اور گدلی انتڑیوں میں کیچ کھولتا ہے
سجی ہوئی میزوں پر
حریص معدے الٹ جاتے ہیں
ماتھوں پر دعائیں، داغ بن جاتی ہیں
اور آہنی دانتوں میں
دل چبا دیئے جاتے ہیں
باتوں کی آگ سے ہونٹ سیاہ ہو جاتے ہیں
زخمی ہاتھوں سے پوریں جھڑ جاتی ہیں
بستروں پر بغل گیر تعفن بُو چھوڑ دیتا ہے
کھوپڑیوں میں علوم کے کیڑے
کلبلاتے رہ جاتے ہیں
کوکھ کے اندھیرے، کبھی ساتھ نہیں چھوڑتے

لکھ۔

آنکھیں پھوڑ دی جائیں
اعضا اکھاڑ دیئے جائیں
عمارتیں سروں پر آگریں
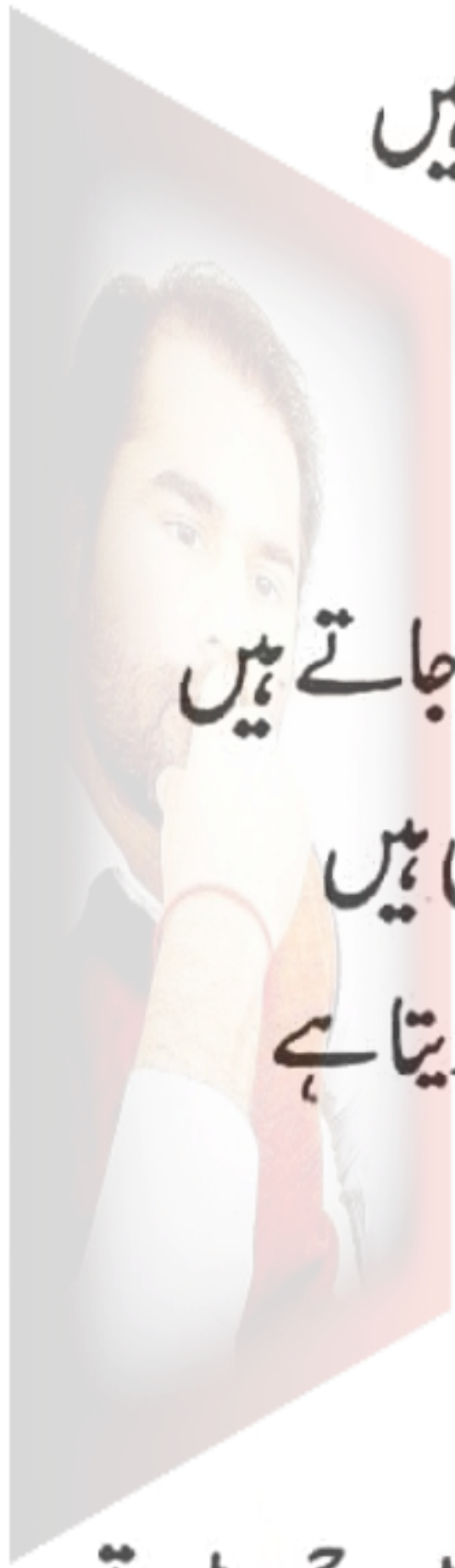
دھرتی پھٹ جائے

اور آسمان کو الٹا لٹکا دیا جائے

اور لکھ ——

اور لکھ ——

"گلیاں ہو جان سنجیاں وچ مرزا یار پھرے"
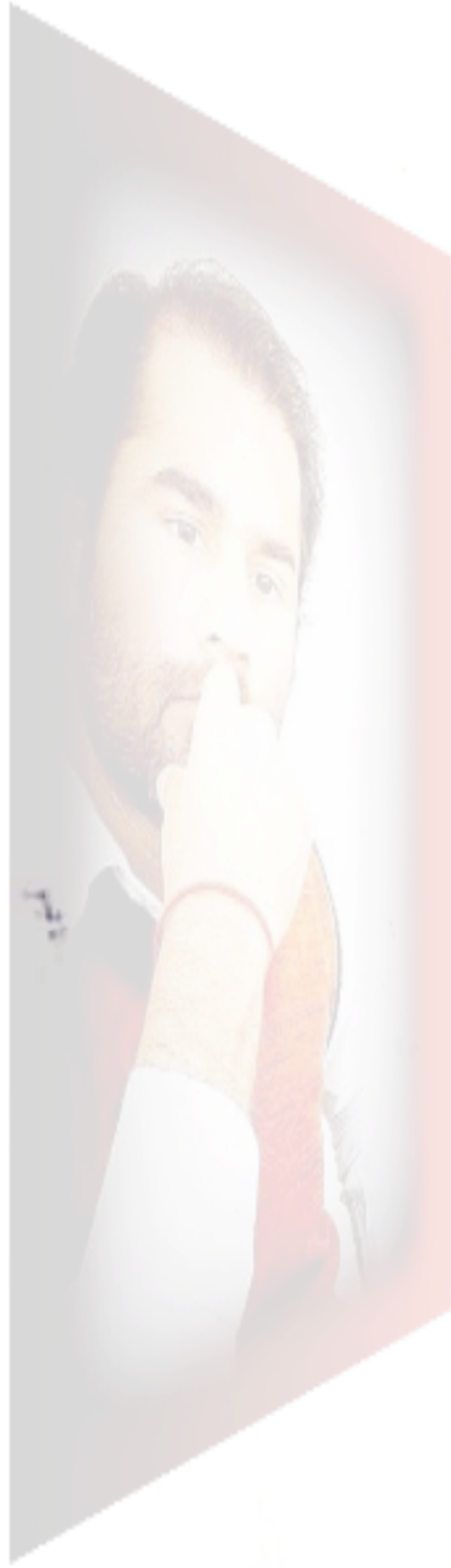
# ہم بے وطن ہیں

سید حسین احسن

ہم خواب ہیں
بچپن کی مٹی میں گوندھے ہوئے
جھکی جھکی دیواروں کی باس ہمارا پہناوا ہے
قدیم گلیوں کی چاپ
ہمارے خال و خد کی پہچان ہے
ہم اپنے ہی چہروں پر شکن در شکن پھیل گئے ہیں

ہمارے اندر

شہروں کے نقش بنتے بگڑتے رہتے ہیں

دریچوں سے جھانکتی آنکھیں گواہ ہیں

ہم بے وطن ہیں

کہ جذبوں کے لمس میں سانس لیتے ہیں

ہم بے گھر ہیں

کہ دیواروں کے احاطے میں ہماری طنابیں اکھڑنے

لگتی ہیں

ہم۔ افق تا بہ افق پھیلی ایک گھنیری ردا

ایک بوندیں برساتی دعا کی بدلی ہیں

جو نامراد شہروں، بے اماں آنگنوں

اور گدلائے چہروں پر

کتنی عمروں سے جھکی ہوئی ہے

ہیشگی، ہمارا وہم ہے

اور فنا، ہمارے مقدر کی پرچھائیں

ہمارے ہونے میں

ہمارے نہ ہونے کی ساری عمر چھپی ہوئی ہے

ہم خواب ہیں

جو اپنے لیے بھی ان دیکھے ہیں
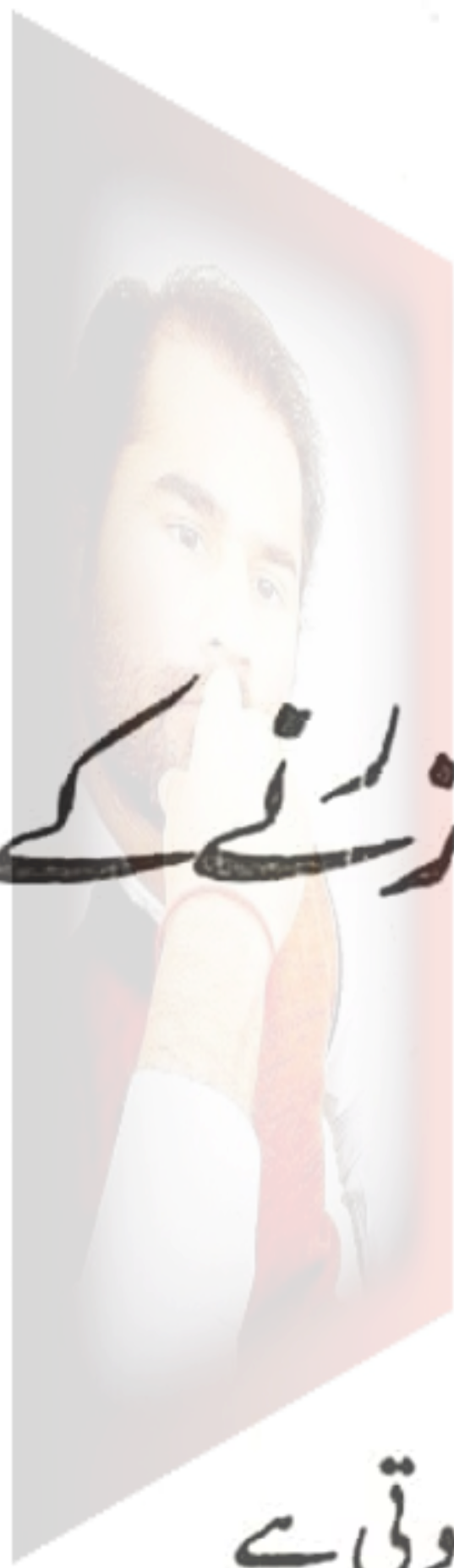
# ہر رات سے گزرنے کے لیے

ہر رات سے گزرنے کے لیے
ایک چاند کی خنک روشنی درکار ہوتی ہے
تاریکی اور اجالے کے مابین
جگمگاتی انگلیوں کی دھارائیں
سینے میں اتر جانے سے ہی
کوئی صورت بن سکتی ہے

وہ کپکپائے دو ہاتھوں کے درمیان
اپنی ہی ہیبت میں سہمے ہوئے
موسم کی طرح ٹھہر گئی ہے
تیری پتلیوں میں ڈوبے چین پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ
میری سانسوں میں بھر گئی ہے
تیرے زمانے
میری آنکھوں میں خواب بن کر پھیلتے جا رہے ہیں
میرے ہونٹوں سے
تیرے نام کے حروف لپٹ گئے ہیں
اور انہیں۔ قدموں کے نیچے کی زمین پر
پپڑیوں کی صورت گرتے ہوئے
دیکھنے سے میں 'پناہ مانگتا ہوں
صدیوں کے بے انت پانیوں کی تھکن
میرے اعضاء کا اضمحلال ہے
میرے ریشوں میں ایک بے پناہ لمس کی توفیق
اپنی طنابیں کھینچ رہی ہے
اور تیری اجلی نیندوں والی گود
میری خوابگاہ کا خواب ہے

تیرے سفید بستر کے سرہانے کھڑا
میں' ایک سیاہ پوش ہم نفس ہوں
جو تیری پیشانی کو
اپنے ہونٹوں کی سیاہی سے
آلودہ کرنا چاہتا ہے
میں' تیرے آنگن میں اترتی شام کے لحاف میں
ماہ و سال چھپا کر
سو جانا چاہتا ہوں
موسموں کے سانس اکھڑ جانے سے پہلے
دھند میں گم ہو جانے سے پہلے
تیری گھنیری شاخوں سے لپٹ کر
دل کھول کر' رو لینا چاہتا ہوں
اور ایسے موسموں کے بیچ
ہونے' نہ ہونے کے آس پاس
میں۔ تیری دہلیز پر
سیٹیاں بجاتی' سسکاریاں لیتی ہوئی
ہوا کی' ایک مسلسل دستک ہوں
جو تیری سماعت کو بھر دینے کے لیے
بے چین ہے
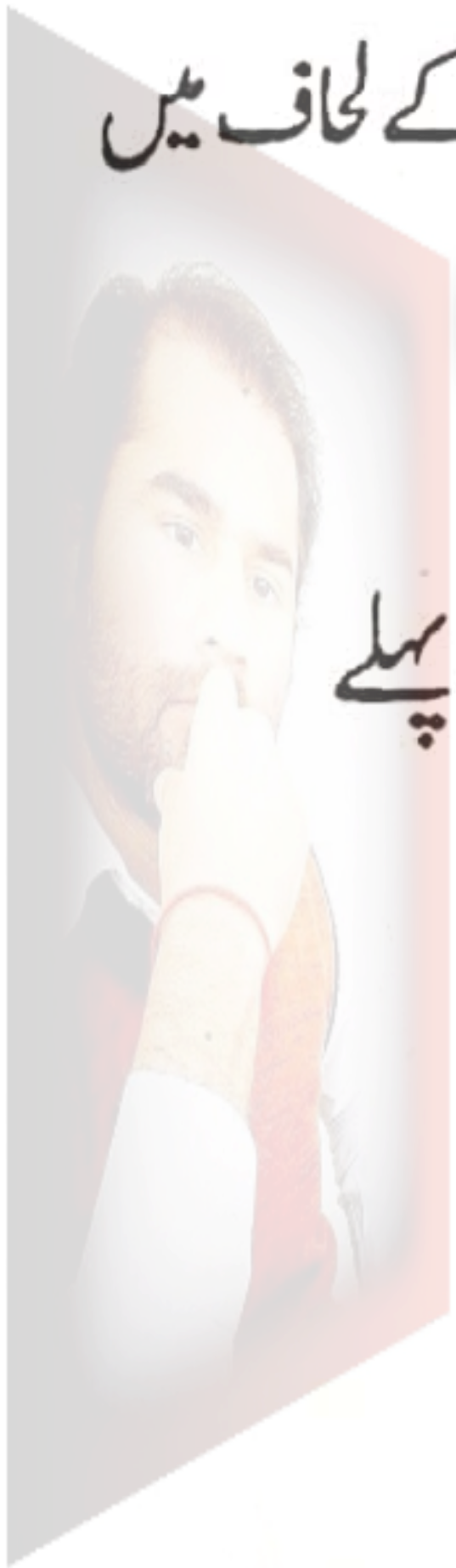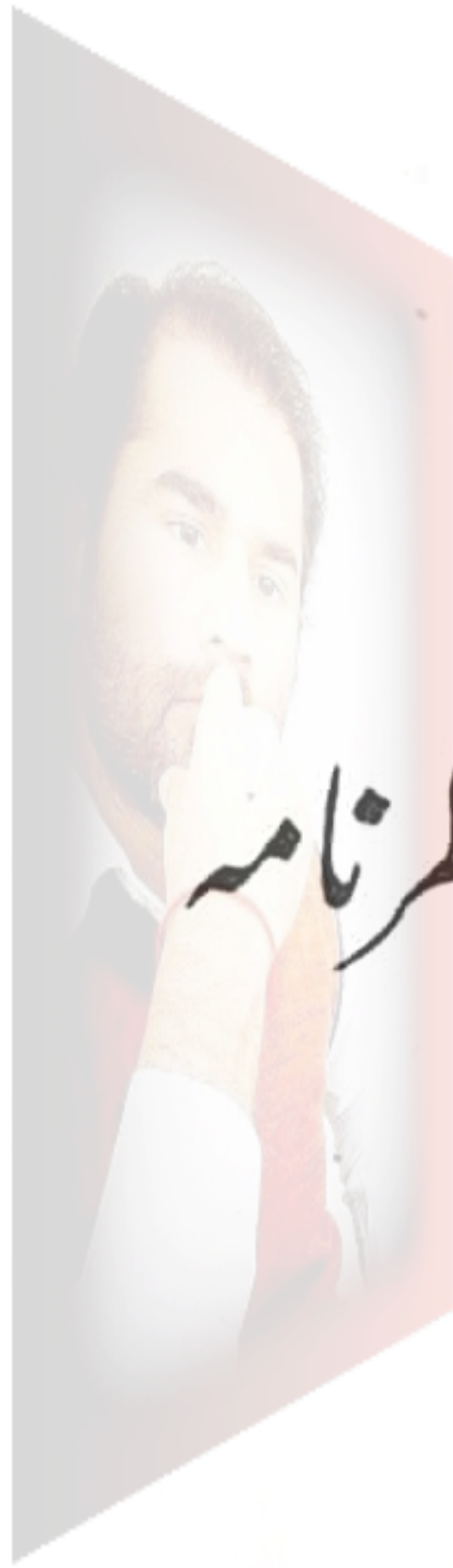
# لمحے کا منظر نامہ

بوندوں کی ٹپ ٹپ میں
کوئی نام کب تک رو سکتا ہے

موسموں سے
کوئی کب تک ہاتھ ملا سکتا ہے

وقت سے
کوئی کب تک الجھ سکتا ہے

ٹوٹی ہوئی کشتی سے
سمندر کے سینے میں کہرام نہیں مچایا جا سکتا
سانسوں کے لنگر گرا دینے سے
لہروں کے سامنے ٹھہرا نہیں جا سکتا
کسی ایک کمرے میں
چند آنسوؤں کے شور سے
دنیا کو متوجہ نہیں کیا جا سکتا
کائنات کو ہلایا نہیں جا سکتا
ویسے بھی
اتنے بڑے کینوس پر
کوئی ایک دھبا ــــــ آخر کتنا پھیل سکتا ہے

## پیش لفظ
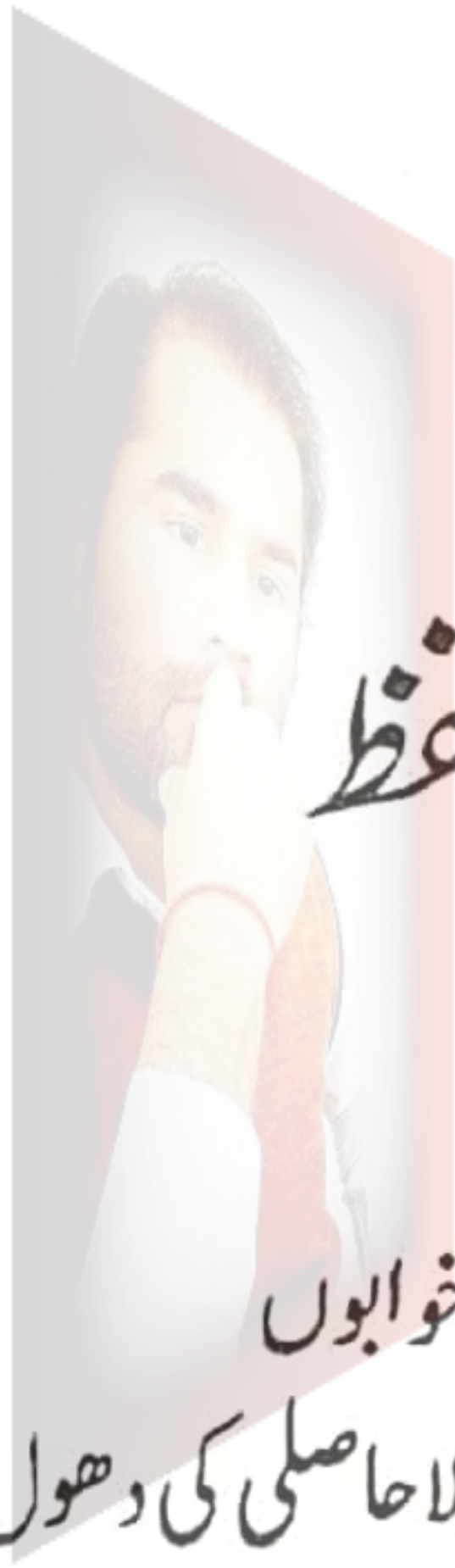
پھول۔ خوشبو اور رنگت کے مٹتے خوابوں

راستے۔ قدموں کے اضمحلال اور لاحاصلی کی دھول

خوشبو۔ کسی بھولے ہوئے چہرے کی اداسی

اور رنگ

ایک ملگجے اندھیرے میں

آنکھوں کی پسپائی کے سوا

ہمیں کیا دیتے ہیں؟

رات۔ ابدی سناٹے کے لمس

بستر۔ ادھڑتی دیواروں سے گرتی مٹی

شور۔ ہونٹوں کی گم شدگی

اور لوگ

غصیلی آوازوں کی بیچارگی کے سوا

قافلے۔ ممنوعہ سمتوں اور گرے ہوئے آنسوؤں

اور فاصلے

وسعت کی دائمی چپ کے سوا

عمریں۔ رگوں میں بجھتے دنوں کی راکھ

رات اور دن۔ تمھارے دیئے ہوئے خوابوں اور

دلاسوں

کتاب۔ متواتر پسپائیوں اور ذلتوں کے بیان

اور علوم

لاعلمی کے مسلسل انکار کے سوا

ہمیں کیا دیتے ہیں

اور تم۔ صدیوں کے دوش سے اترتے ہوئے

فراق کے ابد کا گیت گاتے ہوئے

عمروں کی خاموشی میں
ہماری آنکھوں کو لپیٹتے ہوئے
ہمیں لفظوں کے حوالے کر جاتے ہو
اور لفظ
لایعنی معنویت کے سوا
ہمیں کیا دیتے ہیں؟
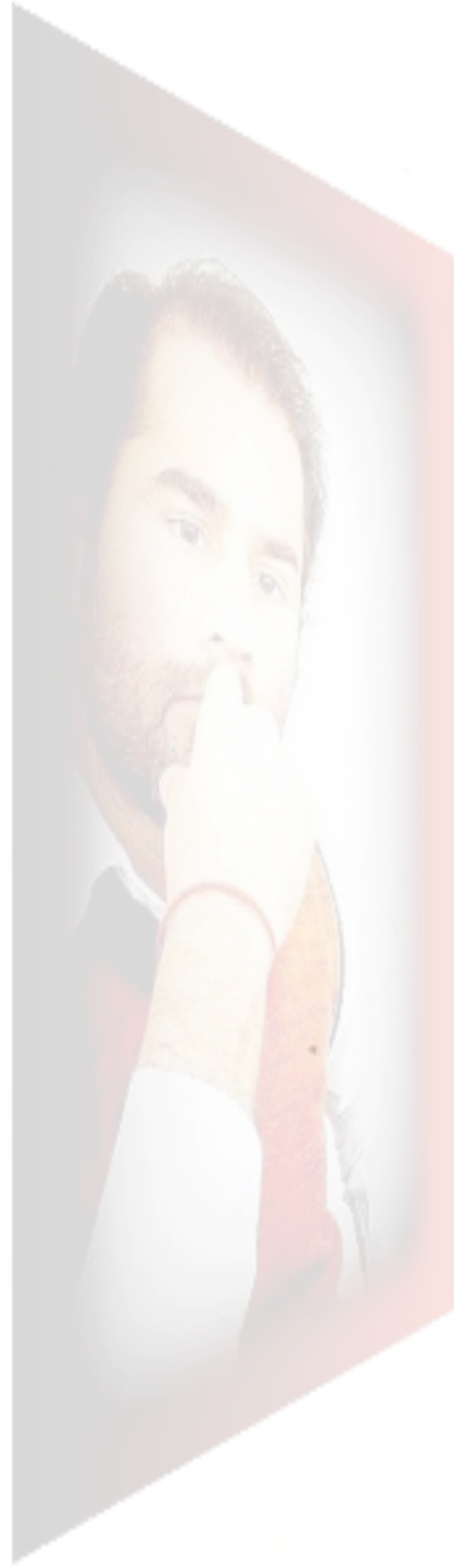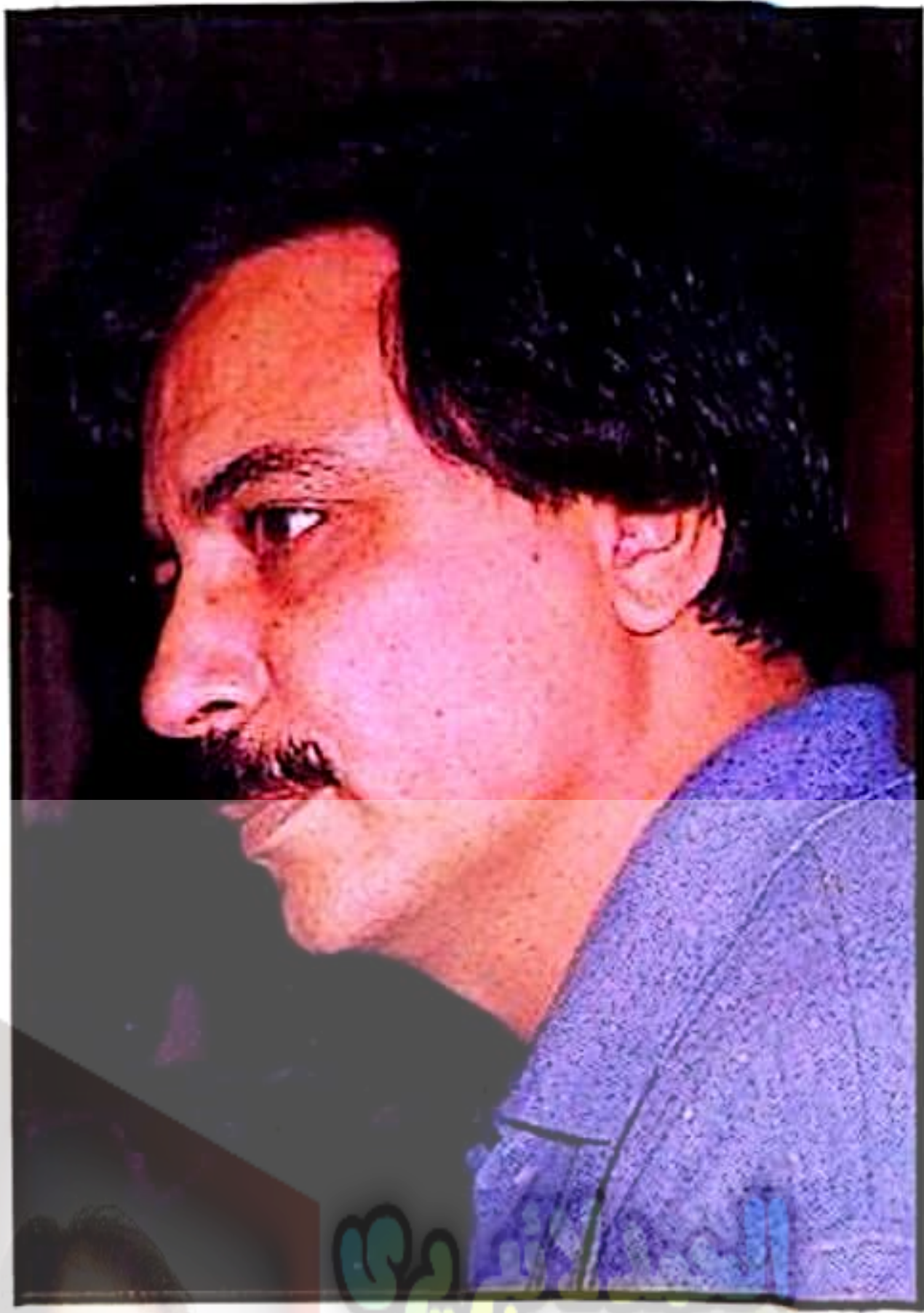
ہر آخری دن سے پہلے ایک اور آخری دن بھی ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے آج کا دن۔ اسے حال بھی کہتے ہیں۔ حال ہی وہ گریزاں حقیقت ہے جس میں مقدر اور تقدیر ایک وحدت میں ڈھلتے ہیں جس نے حال کو پالیا اُس نے مقدر (DESTINY) اور تقدیر (FATE) پر کمند ڈال لی اور صاحب حال کہلایا۔ سچے صُوفی کی طرح سچا شاعر بھی صاحب حال ہوتا ہے۔ اس کے لمحۂ حال میں ماضی اور مستقبل، زمانِ مسلسل اور زمانِ خالص، ازل اور ابد بلکہ عرصۂ محشر بھی منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ پھر جب اظہار کا دریا چڑھتا ہے تو وہ حال کے اِس لمحے کو شاعر کے وجود کے کٹے پھٹے ساحلوں سے اُٹھا کر دوام کے اتھاہ سمندر میں لے جا گراتا ہے۔ ابرار احمد کی نظمیں حال اور دوام کے سنگھم پر کھڑے کھڑے ایک عالمِ حیرت میں لکھی گئی ہیں۔

ظاہر میں پھیلی زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا بھی کسی کسی کو میسّر آتا ہے۔ پھر اپنے باطن میں اُترنا اور اس کی تہ سے کچھ متاعِ معنی خیز نکال کر دُوسروں کی نذر کرنا تو اور بھی کمیاب ہے۔ لیکن ابرار احمد نے محض نظر اور نیند کے سہارے ظاہر اور باطن کی ہی سیاحی نہیں کی، اس نے خیال کو خواب سے ملا کر انسانی واردات کے حوالے سے عدم اور امکان کی سرزمینیں بھی کھنگال ڈالی ہیں۔ ہونے اور نہ ہونے کا وہ سوال جس نے شیکسپیئر سے غالب تک ہر بڑے شاعر کو پریشان رکھا ابرار احمد کو بھی درپیش ہے، خاص طور پر ہونے کا درد اس کے ہاں بہت شدید ہے۔ بے شک ہونے کی سرخوشی بھی کہیں کہیں سر اُٹھاتی ہے لیکن اس سرخوشی کے ساتھ ساتھ اسے وہ معذوری، ذلّت، ہزیمت، ابتری اور بے معنویت بھی یاد رہتی ہے جس سے آج کی انسانی حالت (HUMAN CONDITION) عبارت ہے اور جس نے اس کی نیند اور خوابوں کو داغدار کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کی نظمیں سوتے جاگتے کا ایک نیا قصہ ہیں۔ سوتے سوتے اور جاگتے جاگتے وہ جس خُود کلامی میں محو رہتا ہے وہ اس کی نظموں کا مواد ہے۔ یہ نظمیں اُداسی کی ایک ایسی دبیز لیکن شفاف چادر میں لپٹی ہیں جس کے اندر سے ہم ابرار احمد ہی نہیں اپنے عہد اور اپنی نسل کے نصیب میں لکھے زندگی کے تمام تر درد کو کار فرما دیکھ سکتے ہیں۔

محمد حنیف رامے

# ابرار احمد کے دو شعری مجموعے ایک ہی پی ڈی ایف فائل میں

ڈھیر محبت کرنے والوں کے صدقے
مٹھی بھر نفرت کرنے والوں کی خیر

فریحہ نقوی